کرشن چندر کی کہانیاں

1۔ان داتا(ناولٹ)

2۔دس روپے کا نوٹ

3۔پرانے خدا

ناولٹ

ان داتا

کرشن چندر

وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے!

(ایک غیر ملکی قونصل کے مکتوبات جو اُس نے اپنے افسر اعلیٰ کو کلکتے سے روانہ کیے)

8-اگست 1943ء کلا یوسٹریٹ، موہن شائن ولا

جناب والا

کلکتہ، ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ہوڑہ پُل ہندوستان کا سب سے عجیب وغریب پل ہے۔ بنگالی قوم ہندوستان کی سب سے ذہین قوم ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ کلکتے کا سونا گاچی، ہندوستان میں طوائفوں کا سب سے بڑا بازار ہے۔ کلکتے کا سندر بن چیتوں کی سب سے بڑی شکار گاہ ہے۔ کلکتہ جوٹ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کلکتے کی سب سے بڑھیا مٹھائی کا نام 'رشوگلا' ہے۔ کہتے ہیں اسے ایک طوائف نے ایجاد کیا تھا لیکن شومئ قسمت سے وہ اسے پیٹنٹ نہ کرا سکی کیونکہ ان دنوں ہندوسان میں کوئی ایسا قانون موجود نہ

تھا۔اسی لیے وہ طوائف اپنی زندگی کے آخری ایام میں بھیک مانگتے مری۔ایک الگ پارسل میں حضور پرنور کی ضیافتِ طبع کے لیے دوسوُرشو گلے بھیج رہا ہوں۔اگر انہیں قیمے کے ساتھ کھایا جائے تو بہت مزا دیتے ہیں میں نے خود تجربہ کیا ہے۔

میں ہوں جناب کا ادنیٰ ترین خادم

ایف. بی. پٹاخا

قونصل مملکت سانڈوگھاس برائے کلکتہ

9.اگست،کلایوسٹریٹ

جناب والا

حضور پرنور کی منجھلی بیٹی نے مجھ سے سپیرے کی بانبی کی فرمائش کی تھی۔آج شام بازار میں مجھے ایک سپیرا مل گیا۔پچیس ڈالر دے کر میں نے ایک خوبصورت بانبی خرید لی ہے۔یہ بانبی اسفنج کی طرح ہلکی اور سبک اندام ہے۔یہ ایک ہندوستانی پھل سے جسے ''لوکی'' کہتے ہیں، تیار کی جاتی ہے۔یہ بانبی بالکل آج کی بنی ہوئی ہے اور اسے تیار کرتے وقت کسی مشین سے کام نہیں لیا گیا۔ میں نے اس بانبی پر پالش کرایا ہے اور اسے ساگوان کے ایک خوشنما بکس میں بند کر کے حضور پُرنور کی منجھلی بیٹی ایڈتھ کے لئے بطورِ تحفہ ارسال کر رہا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم

ایف. بی. پٹاخہ

10-اگست

کلکتے میں ہمارے ملک کی طرح راشننگ نہیں ہے۔غذا کے معاملے میں ہر شخص کو مکمل شخصی آزادی ہے۔وہ بازار سے جتنا اناج چاہے خرید لے۔کل مملکت ٹلی کے قونصل نے مجھے کھانے پر مدعو کیا۔چھبیس قسم کے گوشت کے سالن تھے۔سبزیوں اور میٹھی چیزوں کے دو درجن کورس تیار کیے گئے تھے۔(نہایت عمدہ شراب تھی) ہمارے ہاں جیسا کہ حضور اچھی طرح جانتے ہیں پیاز تک راشننگ ہے۔اس لحاظ سے کلکتے کے باشندے بڑے خوش قسمت ہیں۔کھانے پر ایک ہندوستانی انجینئر بھی مدعو تھا۔یہ انجینئر ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ ہے۔باتوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ کلکتے میں قحط پڑا ہوا ہے۔اس پر ٹلی کا قونصل قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور مجھے بھی اس ہنسی میں شریک ہونا پڑا۔دراصل یہ پڑھے لکھے ہندوستانی بھی بڑے

جاہل ہوتے ہیں۔ کتابی علم سے قطع نظر انہیں اپنے ملک کی صحیح کی حالت کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہندوستان کی دوتہائی آبادی دن رات غلہ اور بچے پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس لیے یہاں پر غلے اور بچوں کی کمی کبھی نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ جنگ سے پیشتر تو بہت سا غلہ دساور کو جاتا تھا اور بچے قلی بنا کر جنوبی افریقہ بھیج دیے جاتے ہے۔ اب ایک عرصے سے قلیوں کو باہر بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ اور ہندوستانی صوبوں کو 'ہوم رول' دے دیا گیا ہے۔ مجھے یہ ہندوستانی انجینئر تو کوئی ایجی ٹیٹر قسم کا خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے موسیوژاں ژاں ٹلی کے قونصل سے اس کا تذکرہ چھیڑا تو موسیوژاں ژاں تریپ نے بڑے غور وخوض کے بعد رائے دی کہ ہندوستان اپنے ملک پر حکومت کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتا۔ چونکہ موسیوژاں ژاں تریپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے اس لیے میں اُن کی رائے وقیع سمجھتا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم

ایف، بی، بی

11-اگست

آج صبح بولپور سے واپس آیا ہوں۔ وہاں ڈاکٹر ٹیگور کا ''شانتی نکیتیان'' دیکھا۔ کہنے کو تو یہ ایک یونیورسٹی ہے لیکن پڑھائی کا یہ عالم ہے کہ طالب علموں کے بیٹھنے کے لیے ایک بنچ بھی نہیں۔ استاد اور طالب علم سبھی درختوں کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں اور خدا جانے کچھ پڑھتے بھی ہیں یا یوں ہی اونگھتے ہیں۔ میں وہاں سے بہت جلد چلا آیا کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی اور اوپر درختوں کی شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔

ف، ب، پ

12-اگست

آج چینی قونصل کے ہاں لنچ پر پھر کسی نے کہا کہ کلکتے میں سخت قحط پڑا ہوا ہے۔ لیکن وثوق سے کوئی کچھ نہ کہہ سکا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ ہم سب لوگ حکومت بنگال کے اعلان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اعلان کے جاری ہوتے ہی حضور کو مزید کوائف سے مطلع کروں گا۔ بیگ میں حضور پرنور کی منجھلی بیٹی ایڈتھ کے لیے ایک جوتی بھی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ جوتی سبز رنگ کے سانپ کی جِلد سے بنائی گئی ہے۔ سبز رنگ کے سانپ برما میں بہت ہوتے ہیں۔ اُمید ہے کہ جب برما دوبارہ حکومت انگلشیہ کی عمل داری میں آجائے گا تو ان جوتوں کی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہو سکے گا۔

میں ہوں جناب کا وغیرہ وغیرہ

ایف، بی، پی

13-اگست

آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئیں ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید 'سوکھیا' کی بیماری میں مبتلا تھیں۔ ادھر بنگال میں اور غالباً سارے ہندوستان میں 'سوکھیا' کی بیماری پھیلی ہوئی ہے، اس عارضے میں انسان گھلتا جاتا ہے اور آخر میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مر جاتا ہے۔ یہ بڑی خوفناک بیماری ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی علاج دریافت نہیں ہوا۔ کونین کثرت سے مفت تقسیم کی جارہی ہے لیکن کونین میگنیشیا یا کسی اور مغربی دوا سے اس عارضے کی شدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ایشیائی بیماریوں کی نوعیت مغربی امراض سے مختلف ہے، بہت مختلف ہے۔ یہ اختلاف اس مفروضے کا بدیہی ثبوت ہے کہ ایشیائی اور مغربی دو مختلف انسان ہیں۔

حضور پرنور کی رفیقہ حیات کے باسٹھویں جنم دن کی خوشی میں بدھ کا ایک مرمر کا بت ارسال کر رہا ہوں۔ اسے میں نے پانسوڈالر میں خریدا ہے۔ یہ مہاراجہ بندھوسار کے زمانے کا ہے اور مقدس راہب خانے کی زینت تھا۔ حضور پرنور کی رفیقہ حیات کے ملاقاتیوں کے میں کمرے میں خوب سجے گا۔

مکرر عرض ہے کہ سفارت خانے کے باہر پڑی ہوئی لاشوں میں ایک بچہ بھی تھا جو اپنی مردہ ماں کے تھنوں سے دودھ چوسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ہسپتال بھجوا دیا ہے۔

حضور پُرنور کا غلام

ایف، بی، پی

14-اگست

ڈاکٹر نے بچے کو ہسپتال میں داخل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بچہ ابھی سفارت خانے میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ حضور پرنور کی ہدایات کا انتظار ہے۔ اٹلی کے قونصل نے مشورہ دیا ہے کہ اس بچے کو جہاں سے پایا تھا وہیں چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اپنی حکومت کے صدر سے مشورہ کیے بغیر کوئی ایسا اقدام کروں جس کے سیاسی نتائج نہ جانے کتنے مہلک ہوں۔

ایف، بی، پی

16-اگست

سفارت خانے کے باہر پھر لاشیں پائی گئیں۔ یہ سب لوگ اسی بیماری کا شکار معلوم ہوتے تھے، جس

کا میں اپنے گذشتہ مکتوب میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے بچے کو انہی لاشوں میں چپکے سے رکھ دیا اور پولیس کو ٹیلیفون کر دیا کہ وہ انہیں سفارت خانے کی سیڑھیوں سے اٹھانے کا بندوبست کرے۔ اُمید ہے آج شام تک سب لاشیں اٹھ جائیں گی۔

ایف، بی، پی

17-اگست

کلکتے کے انگریزی اخبار 'سٹیٹسمین' نے اپنے افتتاحیہ میں آج اس امر کا اعلان کیا ہے کہ کلکتے میں سخت قحط پھیلا ہوا ہے۔ یہ اخبار چند روز سے قحط زدگان کی تصاویر بھی شائع کر رہا ہے۔ ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فوٹو اصلی ہیں یا نقلی، بظاہر یہ فوٹو سوکھیا بیماری کے مریضوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تمام غیر ملکی قونصل اپنی رائے ''محفوظ'' رکھ رہے ہیں۔

ف، ب، پ

20-اگست

سوکھیا بیماری کے مریضوں کو اب ہسپتال میں داخل کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کلکتے ہی میں روز دو ڈھائی سو آدمی اس بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں اور اب یہ بیماری ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ڈاکٹر لوگ بہت پریشان ہیں کیونکہ کونین کھلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مرض میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ ہاضمے کا مکسچر، میگنیشیا مکسچر اور ٹنکچر آئیودین یعنی پورا 'برٹش فارما کوپیا' بے کار ہے۔ چند مریضوں کا خون لے کر مغربی سائنسدانوں کے پاس بغرض تحقیقات بھیجا جا رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ کسی غیر معمولی مغربی ایکسپرٹ کی خدمات بھی حاصل کی جائیں یا ایک رائل کمیشن بٹھا دیا جائے جو چار پانچ سال میں اچھی طرح چھان بین کر کے اس امر کے متعلق اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے۔ الغرض ان غریب مریضوں کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ آگے جیسا بائبل میں لکھا ہے: اللہ مالک ہے۔ گو بنگالی اخباروں میں بڑی شدومد کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ سارے بنگال میں قحط کا دور دورہ ہے اور ہزاروں آدمی ہر ہفتے غذا کی کمی کی وجہ سے مر جاتے ہیں لیکن ہماری نوکرانی (جو خود بنگالن ہے) کا خیال ہے کہ یہ اخبار چی جھوٹ بولتے ہیں۔ جب وہ بازار میں چیزیں خریدنے جاتی ہے تو اسے ہر چیز مل جاتی ہے۔ دام بے شک بڑھ گئے ہیں۔ لیکن یہ مہنگائی تو جنگ کی وجہ سے ناگزیر ہے۔

ف، ب، پ

25-اگست

آج سیاسی حلقوں نے قحط کی تردید کردی ہے۔ بنگال اسمبلی نے جس میں ہندوستانی ممبروں اور وزراء کی کثرت ہے آج اعلان کر دیا ہے کہ کلکتے اور بنگال کا علاقہ 'قحط زدہ علاقہ' قرار نہیں دیا سکتا۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ بنگال میں فی الحال راشننگ نہ ہوگا۔ یہ خبر سن کر غیر ملکی قونصلوں کے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی، کیونکہ اگر بنگال قحط زدہ علاقہ قرار دے دیا جاتا ہے تو راشننگ کا فی الفور نفاذ ہوتا اور _ میرا مطلب ہے کہ اگر راشننگ کا نفاذ ہوتا تو اس کا اثر ہم لوگوں پر بھی پڑتا۔ موسیو سی گل جو فرنچ قونصل ہیں کل ہی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ عین ممکن ہے راشننگ ہو جائے، اس لیے تم ابھی سے شراب کا بندوبست کرلو۔ میں چندر نگر سے فرنسیسی شراب منگوانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ سنا ہے کہ چندر نگر میں کئی سو سال کی پرانی شراب بھی دستیاب ہوتی ہے بلکہ اکثر شرابیں تو انقلاب فرانس سے بھی پہلے کی ہیں۔ اگر حضور پرنور مطلع فرمائیں تو چند بوتلیں چکھنے کے لیے بھیج دوں۔

ف، ب، پ

28-اگست

کل ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں نے نیو مارکیٹ سے اپنی سب سے چھوٹی بہن کے لیے چند کھلونے خریدے۔ ان میں ایک چینی کی گڑیا بہت ہی حسین تھی اور ماریا کو بے حد پسند۔ میں نے ڈیڑھ ڈالر دے کر وہ گڑیا بھی خرید لی اور ماریا کو انگلی سے لگائے باہر آ گیا۔ کار میں بیٹھنے کو تھا کہ اک ادھیڑ عمر کی بنگالی عورت نے میرا کوٹ پکڑ کر مجھے بنگالی زبان میں کچھ کہا۔ میں نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا اور کار میں بیٹھ کر اپنے بنگالی شوفر سے پوچھا:

''یہ کیا چاہتی ہے؟''

ڈرائیور بنگالی عورت سے بات کرنے لگا۔ اس عورت نے جواب دیتے ہوئے اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کیا جسے وہ اپنے شانے سے لگائے کھڑی تھی۔ بڑی بڑی موٹی آنکھوں والی زرد رو بچی بالکل چینی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی ار ماریا کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

پھر بنگالی عورت نے تیزی سے کچھ کہا۔ بنگالی ڈرائیور نے اسی سرعت سے جواب دیا۔

''کیا کہتی ہے یہ'' میں نے پوچھا۔

ڈرائیور نے اس عورت کی ہتھیلی پر چند سکے رکھے اور کار آگے بڑھائی۔ کار چلاتے چلاتے بولا:

''حضور یہ اپنی بچی بیچنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ روپے میں۔''

ڈیڑھ روپے میں۔ یعنی نصف ڈالر میں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا: ''ارے نصف ڈالر میں تو

چینی کی گڑیا بھی نہیں آتی ؟''

''آج کل نصف ڈالر میں بلکہ اس سے بھی کم قیمت پر ایک بنگالی بچی مل سکتی ہے صاحب!''

میں حیرت سے اپنے ڈرائیور کو تکتا رہ گیا۔

اس وقت مجھے اپنے وطن کی تاریخ کا وہ باب یاد آیا۔ جب ہمارے آباواجداد افریقہ سے حبشیوں کو زبردستی جہاز میں لاد کر اپنے ملک میں لے آتے تھے اور منڈیوں میں غلاموں کی خرید وفروخت کرتے تھے۔ان دنوں ایک معمولی سے معمولی حبشی بھی پچیس تیس ڈالر سے کم میں نہیں بکتا تھا۔اُفوہ، کس قدر غلطی ہوئی۔ ہمارے بزرگ اگر افریقہ کے بجائے ہندوستان کا رُخ کرتے تو بہت سستے داموں غلام حاصل کر سکتے تھے۔حبشیوں کے بجائے اگر وہ ہندوستان کی تجارت کرتے تو لاکھوں ڈالر کی بچت ہو جاتی۔ایک ہندوستانی لڑکی نصف ڈالر میں! اور ہندوستان کی کُل آبادی چالیس کروڑ ہے۔ گویا بیس کروڑ ڈالر میں ہمارے پورے ہندوستان کی آبادی خرید سکتے تھے۔ ذرا خیال تو فرمائے کہ بیس کروڑ ڈالر ہوتے کتنے ہیں۔اس سے زیادہ رقم تو ہمارے وطن میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔اگر حضور پُر نور کی منجھلی بیٹی کو یہ پسند ہو تو میں ایک درجن بنگالی لڑکیاں بذریعہ ہوائی جہاز پارسل کر دوں! مجھے شوفر نے بتایا ہے کہ آج کل 'سونا گاچی' جہاں کلکتے کی طوائفیں رہتی ہیں، اس قسم کی بردہ فروشی کا اڈا ہے۔سینکڑوں کی تعداد میں لڑکیاں شب وروز فروخت کی جارہی ہیں۔لڑکیوں کے والدین فروخت کرتے ہیں اور رنڈیاں خریدتی ہیں۔ عام نرخ سوا روپے ہے۔لیکن اگر بچی قبول صورت ہو تو چار پانچ بلکہ دس روپے بھی مل جاتے ہیں۔ چاول آج کل ستر روپے فی من ملتا ہے۔اس حساب سے اگر ایک کنبہ اپنی دو بچیاں بھی فروخت کر دے تو کم از کم آٹھ دس دن اور زندگی کا دھندہ کیا جا سکتا ہے۔اور اوسطاً بنگالی کنبے میں لڑکیوں کی تعداد دو(2) سے زیادہ ہوتی ہے۔

کل مئیر آف کلکتہ نے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے، وہاں یقیناً دلچسپ باتیں سننے میں آئیں گی۔

ف.ب.پ

29-اگست

میئر آف کلکتہ کا خیال ہے کہ بنگال میں شدید قحط ہے اور حالت بے حد خطرناک ہے۔اس نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اپنی حکومت کو بنگال کی مدد کے لیے آمادہ کروں۔ میں نے اسے اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا، لیکن یہ امر بھی اس واضح کر دیا کہ یہ قحط ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور ہماری حکومت کسی دوسری قوم کے معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتی۔ہم سچے جمہوریت پسند ہیں اور کوئی سچا جمہوریہ آپ کی

آزادی سلب کرنا نہیں چاہتا۔ ہر ہندوستانی کو جینے یا مرنے کا اختیار ہے۔ یہ ایک شخصی یا زیادہ سے زیادہ ایک قومی مسئلہ ہے اور اس کی نوعیت بین الاقوامی نہیں۔ اس موقعہ پر موسیوژاں ژاں تریپ بھی بحث میں شامل ہو گئے اور کہنے لگے: جب آپ کی اسمبلی نے بنگال کو قحط زدہ علاقہ (Famine Area) ہی نہیں قرار دیا تو اس صورت میں آپ دوسری حکومتوں سے مدد کیونکہ طلب کر سکتے ہیں۔ اس پر میٹر آف کلکتہ خاموش ہو گئے اور رس گلے کھانے لگے۔

ف.ب.پ

30-اگست

مسٹر ایموی نے جو برطانوی وزیر ہند ہیں۔ ہاؤس آف کامنز میں ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ ''ہندوستان میں آبادی کا تناسب غذائی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں ڈیڑھ سو گنا اضافہ ہوا ہے درحالیکہ زمینی پیداوار بہت کم بڑھی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہندوستانی بہت کھاتے ہیں۔''

یہ تو حضور میں نے بھی آزمایا ہے کہ ہندوستانی لوگ دن میں دو بار بلکہ اکثر حالتوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں لیکن اس قدر کھاتے ہیں کہ ہم مغربی لوگ دن میں پانچ بار بھی اس قدر نہیں کھا سکتے۔ موسیوژاں ژاں تریپ کا خیال ہے کہ بنگال میں شرح اموات کے بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کا پیٹو پن ہے۔ یہ لوگ اتنا کھاتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں پیٹ پھٹ ضرور ہوتا ہے۔ اور وہ جہنم واصل ہو جاتے ہیں چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ہندوستانی کبھی منہ پھٹ نہیں ہوتا لیکن حضور میں نے تو جتنے ہندوستانی دیکھے سب کو منہ پھٹ، پیٹ پھٹ بلکہ اکثر حالتوں میں تلی پھٹ بھی پایا۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہندوستانیوں اور چوہوں کی شرح پیدائش دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور اکثر حالتوں ان دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی جلدی پیدا ہوتے ہیں اتنی جلدی مر جاتے ہیں۔ اگر چوہوں کو پلیگ ہوتی ہے تو ہندوستانیوں کو 'سوکھیا' بلکہ عموماً پلیگ اور سوکھیا دونوں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بہرحال جب تک چوہے اپنے بل میں رہیں اور دنیا کو پریشان نہ کریں۔ ہمیں ان کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

غذائی محکمے کے ممبر حالات کی جانچ پڑتال کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بنگالی حلقوں میں یہ اُمید ظاہر کی جا رہی ہے کہ آنریبل ممبر پر اب یہ واضح ہو جائے گا کہ بنگال میں واقعی قحط ہے اور شرح اموات کے بڑھنے کا سبب بنگالیوں کی انارکسٹانہ حرکات نہیں غذائی بحران ہے۔

ف، ب، پ

20- ستمبر

آنریبل ممبر تحقیقات کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔سنا ہے وہاں حضور وائسرائے بہادر سے ملاقات کریں گے اور اپنی تجاویز ان کے سامنے رکھیں گے۔

ف،ب،پ

25- ستمبر

لندن کے انگریزی اخباروں کی اطلاع کے مطابق ہر روز کلکتے کی گلیوں، سڑکوں اور فٹ پاتھ پر لوگ مرجاتے ہیں۔ بہرحال یہ سب اخباری اطلاعیں ہیں۔سرکاری طور پر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بنگال میں قحط ہے۔سب لوگ پریشان ہیں۔چینی قونصل کل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ بنگال کے فاقہ کشوں کے لیے ایک امدادی فنڈ کھولنا چاہتا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔کوئی کہتا ہے کہ قحط ہے، کوئی کہتا ہے قحط نہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھایا: بیوقوف نہ بنو۔اس وقت تک ہمارے پاس مصدقہ اطلاع یہی ہے کہ غذائی بحران اس لیے ہے کہ ہندوستانی بہت زیادہ کھاتے ہیں۔اب تم ان لوگوں کے لیے ایک امدادی فنڈ کھول کر گویا ان کے پیٹو پن کو اور شہ دو گے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن چینی قونصل میری تشریحات سے غیر مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

ف،ب،پ

28 ستمبر

دلی میں مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس بلائی جارہی ہے۔آج پھر یہاں کئی سو لوگ 'سوکھیا' سے مرگئے۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ مختلف صوبائی حکومتوں نے رعایا میں اناج تقسیم کرنے کی جو سکیم بنائی تھی اس سے انھوں نے کئی لاکھ روپے کا منافع حاصل کیا ہے۔اس میں بنگال کی حکومت بھی شامل ہے۔

ف،ب،پ

20- اکتوبر

کل گرانڈ ہوٹل میں 'یوم بنگال' منایا گیا۔ کلکتے کے یورپین امراء وشرفا کے علاوہ حکام اعلیٰ، شہر کے بڑے سیٹھ اور مہاراجے بھی اس دلچسپ تفریح میں شریک تھے۔ڈانس کا انتظام خاص طور پر اچھا تھا۔ میں نے مسز جیولٹ تریپ کے ساتھ دو مرتبہ ڈانس کیا (مسز تریپ کے منہ سے لہسن کی بو آتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟) مسز تریپ سے یہ معلوم ہوا کہ اس جشن ماہتابی کے موقعہ پر یوم بنگال کے سلسلے میں نو لاکھ روپیہ

اکٹھا ہوا ہے۔ مسز تریپ بار بار چاند کی خوبصورتی اور رات کی سیاہ ملائمت کا ذکر کر رہی تھیں اور ان کے منہ سے لہسن کے بپھارے آٹھ رہے تھے۔ جب مجھے ان کے ساتھ دوبارہ ڈانس کرنا پڑا تو میرا جی چاہتا تھا کہ ان کے منہ پر لائی سول یا فینائل چھڑک کر ڈانس کروں۔ پھر خیال آیا کہ مسٹر جیولٹ تریپ موسیو ژاں ژاں تریپ کی باوقار بیوی ہیں اور موسیو ژاں ژاں تریپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک قابل رشک مرتبہ حاصل ہے!

ہندوستانی خواتین میں مس سہنا سے تعارف ہوا۔ بڑی قبول صورت ہے اور بے حد اچھا ناچتی ہے!

ف، ب، پ

26، اکتوبر

مسٹر منشی حکومت بمبئی کے ایک سابق وزیر کا اندازہ ہے کہ بنگال میں ہر ہفتے قریباً ایک لاکھ افراد قحط کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری اطلاع نہیں ہے۔ قونصل خانے کے باہر آج پھر چند لاشیں پائی گئیں۔ شوفر نے بتایا کہ یہ ایک پورا خاندان تھا جو دیہات سے روٹی کی تلاش میں کلکتہ آیا تھا۔ پرسوں بھی اسی طرح میں ایک مغنی کی لاش دیکھی تھی ایک ہات میں وہ اپنی ستار پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہات میں لکڑی کا ایک جھنجھنا۔ سمجھ میں نہیں آیا اس کا کیا مطلب تھا.... بے چارے چوہے، کس طرح چپ چاپ مر جاتے ہیں اور زبان سے آف تک بھی نہیں کرتے۔ میں نے ہندوستانیوں سے زیادہ شریف چوہے دنیا میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ اگر امن پسندی کے لیے نوبل پیس پرائز کسی قوم کو مل سکتا ہے تو وہ ہندوستانی ہیں۔ یعنی لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر جاتے ہیں۔ لیکن زبان پر اک کلمہ شکایت نہیں لائیں گے صرف بے روح، بے نور آنکھوں سے آسمان کی طرف تاکتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں: 'ان داتا! ان داتا، کل رات پھر مجھے اس مغنی کی خاموش شکایت سے معمور، جامد و ساکت، پتھریلی بے نور نگاہیں پریشان کرتی رہیں۔

ف، ب، پ

5- نومبر

نئے حضور وائسرائے بہادر تشریف لائے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے فوج کو قحط زدہ لوگوں کی امداد پر مامور کیا ہے اور جو لوگ کلکتے کے گلی کوچوں میں مرنے کے عادی ہو چکے ہیں ان کے لیے باہر مضافات میں مرکز کھول دیے گئے ہیں۔ جہاں ان کی آسائش کے لیے سب سامان بہم پہنچایا جائے گا۔

ف، ب، پ

10-نومبر

موسیوژاں ژاں تریپ کا خیال ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ بنگال میں واقعی قحط ہو اور سوکھیا کی بیماری کی اطلاعیں غلط ہوں۔ غیر ملکی قونصل خانوں میں اس ریمارک سے ہلچل مچ گئی ہے۔ مملکت گوبیا، لوبیا اور مسٹر سلووکیا کے قونصلوں کا خیال ہے کہ موسیوژاں ژاں تریپ کا یہ جملہ کسی آنے والی خوفناک جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ یورپی اور ایشیائی ملکوں سے بھاگے ہوئے لوگوں میں جو آج کل ہندوستان میں مقیم ہیں وائسرائے کی اس سکیم کے متعلق مختلف شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ لوگ سوچ رہے ہیں اگر بنگال واقعی قحط زدہ علاقہ قرار دے دیا گیا تو ان کے الاؤنس کا کیا بنے گا؟ وہ لوگ کہاں جائیں گے؟ میں حضور پرنور کی توجہ اس سیاسی الجھن کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو وائسرئے بہادر کے اعلان سے پیدا ہو گئی ہے۔ (Refugeeds) کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیا ہمیں سینہ سپر ہو کر نہ لڑنا چاہیے۔ مغربی تہذیب، کلچر اور تمدن کے کیا تقاضے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں کیا اٹھانا چاہیے۔ میں اس سلسلے میں حضور پرنور کے احکام کا منتظر ہوں۔

ف، ب، پ

25-نومبر

موسیوژاں ژاں تریپ کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط نہیں ہے۔ موسیو فاں فاں فنگ چینی قونصل کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ حضور نے مجھے جس کام کے لیے کلکتہ کے قونصل خانے میں تعینات کیا تھا وہ کام میں گذشتہ تین ماہ میں بھی پورا نہ کر سکا۔ میرے پاس اس امر کی ایک بھی مصدقہ اطلاع نہیں ہے۔ کہ بنگال میں قحط ہے یا نہیں ہے۔ تین ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد بھی مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ صحیح ڈپلومیٹک پوزیشن کیا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔ شرمندہ ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔

نیز عرض ہے کہ حضور پرنور کی منجھلی بیٹی کو مجھ سے اور حضور پرنور کی منجھلی بیٹی سے مجھے عشق ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر ہو گا کہ حضور پرنور مجھے کلکتے کے سفارت خانے سے واپس بلا لیں اور میری شادی اپنی بیٹی ___ میرا مطلب ہے حضور پرنور کی منجھلی بیٹی سے کر دیں اور حضور پرنور مجھے کسی ممتاز سفارت خانے میں سفیر اعلیٰ کا مرتبہ بخش دیں۔ اس نوازش کے لیے میں حضور پرنور کا تا قیامت شکر گذار رہوں گا۔

ایڈتھ کے لیے ایک نیلم کی انگوٹھی ارسال کر رہا ہوں اسے مہاراجہ اشوک کی بیٹی پہنا کرتی تھی۔

میں ہوں جناب کا حقیر ترین خادم

ایف، بی، پٹانحہ
قونصل مملکت سانڈوگھاس۔ برائے کلکتہ

وہ آدمی جو مر چکا ہے!

صبح ناشتے پر جب اس نے اخبار کھولا تو اس نے بنگال کے فاقہ کشوں کی تصاویر دیکھیں جو سڑکوں پر، درختوں کے نیچے، گلیوں میں، کھیتوں میں، بازاروں میں، گھروں میں، ہزاروں کی تعداد میں مر رہے تھے۔ آملیٹ کھاتے کھاتے اس نے سوچا کہ ان غریبوں کی امداد کس طرح ممکن ہے۔ یہ غریب جو نا اُمیدی کی منزل سے آگے جا چکے ہیں اور موت کی بحرانی کیفیت سے ہمکنار ہیں، انہیں زندگی کی طرف واپس لانا، زندگی کی صعوبتوں سے دوبارہ آشنا کرنا، ان سے ہمدردی نہیں دشمنی ہوگی۔ اس نے جلدی میں اخبار کا ورق اُلٹا اور توس پر مربہ لگا کر کھانے لگا۔ توس نرم گرم اور کرکرا تھا اور مربے کی مٹھاس اور اس کی ہلکی سے ترشی نے اس کے ذائقے کو اور بھی نکھار دیا تھا، جیسے غازے کا غبار عورت کے حسن کو نکھار دیتا ہے۔ یکا یک اسے سنیہہ کا خیال آیا۔ سنیہہ ابھی تک نہ آئی تھی گو اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح کے ناشتے پر اس کے ساتھ موجود ہوگی، سو رہی ہوگی بے چاری!... اب کیا وقت ہوگا، اس نے اپنی سونے کی گھڑی سے پوچھا جو اس کی گوری کلائی میں جس پر سیاہ بالوں کی اک ہلکی سی ریشمی لائن تھی، اک سیاہ ریشمی فیتے سے بندھی تھی۔ گھڑی، قمیض کے بٹن اور ٹائی کا پن، یہی تین زیور مرد پہن سکتا ہے اور عورتوں کو دیکھیے کہ جسم کو زیور سے ڈھک لیتی ہیں۔ کان کے لیے زیور، پاؤں کے لیے زیور، کر کے لیے زیور، ناک کے لیے زیور، سر کے لیے زیور، گلے کے لیے زیور، بانہوں کے لیے زیور اور مرد بے چارے کے لیے صرف تین زیور بلکہ دو ہی سمجھیے کیونکہ ٹائی کا پن اب فیشن سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے مردوں کو زیادہ زیور پہننے سے کیوں منع کیا گیا ہے، سوچتے سوچتے وہ دلیا کھانے لگا۔ دلیے سے الائچی کی مہک اُٹھ رہی تھی۔ اس کے نتھنے، اس کے پاکیزہ تعطر سے مصفا ہو گئے اور یکا یک اس کے نتھنوں میں گزشتہ رات کے عطر کی خوشبو بس گئی۔ وہ عطر جو سنیہہ نے اپنی ساڑھی، اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ گزشتہ رات کا دل فریب رقص اس کی آنکھیں کے آگے گھومتا گیا۔ گرانڈ ہوٹل میں ناچ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کا اور سنیہہ کا جوڑا کتنا اچھا ہے۔ سارے ہال کی نگاہیں اُن پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کانوں میں گول گول طلائی آویزے پہنے ہوئے

تھی جواس کی لوؤں کی چھپار ہے تھے۔ہونٹوں پر جوانی کا تبسم اور میکس فیکٹر کی لالی کا معجزہ اور سینے کے سمن زاروں پر موتیوں کی مالا چمکتی، دمکتی، لچکتی، ناگن کی طرح سوبل کھاتی ہوئی۔رمبا ناچ کوئی سنیہہ سے سیکھے۔اس کے جسم کی روانی اور ریشمی بنارسی ساری کا پرشور بہاؤ جیسے سمندر کی لہریں چاندنی رات میں ساحل سے اٹھکیلیاں کررہی ہوں۔لہر آگے آتی ہے، ساحل کو چھو کر واپس چلی جاتی ہے۔مدہم سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے اور چلی جاتی ہے۔شور مدہم ہوتا جاتا ہے۔شور قریب آجاتا ہے،آہستہ آہستہ لہر چاندنی میں نہائے ہوئے ساحل کو چوم رہی ہے۔سنیہہ کے لب نیم وا تھے جن میں دانتوں کی لڑی سپید موتیوں کی مالا کی طرح لرزتی نظر آتی تھی.... یکا یک ہال میں بجلی..بجھ گئی اور وہ اور سنیہہ ہونٹ سے ہونٹ ملانے ،جسم سے جسم لگائے ،آنکھیں بند کیے رقص کے تال پر ناچتے رہے۔ہائے ،ان سروں کی مدہم سی روانی، وہ رسیلا میٹھا تموج، رواں دواں رواں دواں، ازلی موت کی سی پاکیزگی، نیند اور خمار اور نشہ جیسے جسم نہ ہو، جیسے زندگی نہ ہو، جیسے تو نہ ہو، جیسے میں نہ ہو۔صرف ایک بوسہ ہو،صرف ایک گیت ہو،اک لہر ہو رواں دواں، رواں دواں ....اس نے سیب کے قتلے کیے اور کانٹے سے اُٹھا کر کھانے لگا۔پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے اس نے سوچا:سنیہہ کا جسم کتنا خوبصورت ہے،اس کی روح کتنی حسین ہے،اس کا دماغ کس قدر کھوکھلا ہے....اسے پُرمغز عورتیں بالکل پسند نہ تھیں۔جب دیکھو اشتراکیت، سامراجیت، مارکسیت پر بحث کررہی ہیں۔آزادی تعلیم نسواں ،نوکری، یہ نئی عورت ،عورت نہیں فلسفے کی کتاب ہے۔بھئی ایسی عورت سے ملنے یا شادی کرنے کی بجائے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی ارسطو پڑھا کرے۔اس نے بے قرار ہوکر اک بار پھر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔سنیہہ ابھی تک نہ آئی تھی۔چرچل اور سٹالین اور روز ویلٹ طہران میں دنیا کا نقشہ بدل رہے تھے اور بنگال میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر رہے تھے۔دنیا کو اطلانٹک چارٹر دیا جارہا تھا اور بنگال میں چاولوں کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔اسے ہندوستان کی غربت پر اتنا ترس آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ہم غریب ہیں، بے بس ہیں، نادار ہیں، مجبور ہیں۔ہمارے گھر کا وہی حال ہے جو میرے گھر کا حال تھا۔جس کا ذکر اس نے چوتھی جماعت میں پڑھا تھا اور جو ہر وقت فریاد کرتا رہتا تھا۔جس کی دیواریں سیلی سیلی اور گری ہوئی تھیں اور جس کی چھت ہمیشہ ٹپک ٹپک کر روتی رہتی تھی۔اس نے سوچا ہندوستان بھی ہمیشہ روتا رہتا ہے۔کبھی روٹی نہیں ملتی ،کبھی کپڑا نہیں ملتا،کبھی بارش نہیں ہوتی ،کبھی وبا پھیل جاتی ہے۔اب بنگال کے بیٹوں کو دیکھو، ہڈیوں کے ڈھانچے،

آنکھوں میں ابدی افسردگی، لبوں پر بھکاریوں کی صدا، روٹی، چاول کا ایک دانہ، یکا یک چائے کا گھونٹ اسے اپنے حلق میں تلخ محسوس ہوا اور اس نے سوچا کہ وہ ضرور اپنے ہم وطنوں کی مدد کرے گا، وہ چندہ اکٹھا کرے گا، سارے ہندوستان کا دورہ کرے گا اور چیخ چیخ کر اس کے ضمیر کو بیدار کرے گا۔ دورہ، جلسے، والنٹیر، چندہ، اناج اور زندگی کی اک لہر ملک میں اس سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جائے گی۔ برقی رو کی طرح یکا یک اس نے اپنا نام جلی سرخیوں میں دیکھا۔ ملک کا ہر اخبار اس کی خدمات کو سراہ رہا تھا اور خود اس خبار میں جسے وہ اب پڑھ رہا تھا اسے اپنی تصویر جھانکتی نظر آئی۔ کھدر کا لباس اور جواہر لال کی جیکٹ اور ہاں ویسی ہی خوبصورت مسکراہٹ۔ ہاں بس یہ ٹھیک ہے۔ اس نے بیرے کو آواز دی اور اسے ایک آملیٹ تیار کرنے کو کہا۔ آج سے وہ اپنی زندگی بدل ڈالے گا۔ اپنی حیات کا ہر لمحہ ان بھوکے، ننگے، پیاسے، مرتے ہم وطنوں کی خدمت میں صرف کر دے گا۔ وہ اپنی جان بھی ان کے لیے قربان کر دے گا۔ یکا یک اس نے اپنے آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند دیکھا۔ وہ پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا تھا۔ جلاد نے چہرے پر غلاف اُڑھا دیا اور اس نے اس کھردرے موٹے غلاف کے اندر سے چلا کر کہا: میں مر رہا ہوں، اپنے بھوک، پیاسے، ننگے وطن کے لیے۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو پھر بھر آئے اور دو ایک گرم گرم نمکین بوندیں چائے کی پیالی میں بھی گر پڑیں اور اس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ یکا یک ایک کار پورچ میں رکی اور موٹر کا پٹ کھول کر سنیہہ مسکراتی ہوئی، سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی، دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی، اسے ہیلو کہتی ہوئی، اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے رخسار کو پھول کی طرح اپنے عطر بین ہونٹوں سے چومتی ہوئی نظر آئی۔ بجلی، گرمی، روشنی، مسرت، سب کچھ ایک تبسم میں تھا اور پھر زہر، سنیہہ کی آنکھوں میں زہر تھا، اس کے لبوں میں زہر تھا، اس کے کمر کے لوچ میں زہر تھا، اس کے لمبے قد میں زہر تھا، اس کی زلفوں میں زہر تھا، اس کی مدہم ہلکی سانس کی ہر جنبش میں زہر تھا۔ وہ اجنتا کی تصویر تھی جس کے خط و خال مصور نے زہر سے اُبھارے تھے۔

اس نے پوچھا: ''ناشتہ کرو گی؟''

''نہیں میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔'' پھر سنیہہ نے اس کی پلکوں پر آنسو چھلکتے دیکھے، بولی: ''تم آج اُداس کیوں ہو؟''

وہ بولا: ''کچھ نہیں، یونہی۔ بنگال کے فاقہ کشوں کا حال پڑھ رہا تھا۔ سنیہہ! ہمیں بنگال کے لیے کچھ کرنا چاہیئے۔''

''Poor Darlings,'' سنیہہ نے آہ بھر کر اور جیبی آئینے کی مدد سے اپنے ہونٹوں کی سرخی ٹھیک کرتے ہوئے کہا: ''ہم لوگ ان کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ماسوائے اس کے کہ ان کی روحوں کے لیے پرماتما سے شانتی مانگیں۔''

وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ ''بس یہ بالکل ٹھیک ہے، ہر مندر میں اور ہر مسجد میں مرتے ہوئے بنگالیوں کے لیے، بھوکے، ننگے بنگالیوں کے لیے دعا مانگی جائے۔ کس قدر حسین خیال ہے، سنیہہ تم سمجھدار ہوتی جارہی ہو۔''

''کانوونٹ کی تعلیم ہے نا آخر؟'' اس نے اپنے خوبصورت سپید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

وہ سوچ کر بولا؟ ''ہمیں_ایک_ریزولیوشن بھی پاس کرنا چاہیے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' سنیہہ نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا اور اپنی ساڑھی کا پلو درست کرنے لگی۔

''اب یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔'' وہ بولا، ''اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب کبھی ملک پر کوئی آفت آتی ہے، ریزولیوشن ضرور پاس کیا جاتا ہے۔ سنا ہے ریزولیوشن پاس کر دینے سے سب کام خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے ....میں خیال ہے، میں ابھی ٹیلیفون کر کے شہر کے کسی رہنما سے ریزولیوشن کے بارے میں پوچھتا ہوں۔''

''رہنے بھی دو ڈارلنگ۔'' سنیہہ نے مسکرا کر کہا، ''دیکھو، جُوڑے میں پھول ٹھیک سجا ہے؟''

اس نے نیل راج کی نازک ڈنڈی کو جوڑے کے اندر تھوڑا سا دبا دیا: ''بے حد پیارا پھول ہے۔ نیلا، جیسے کرشن کا جسم، جیسے ناگ کا پھن، جیسے زہر کا رنگ!''

پھر سوچ کر بولا: ''نہیں کچھ بھی ہو ریزولیوشن ضرور پاس ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹیلیفون کرتا ہوں۔''

سنیہہ نے اسے اپنے ہاتھ کی اک ہلکی سی جنبش سے روک لیا۔ گداز اُنگلیوں کا ایک لمس اک ریشمی رو کی طرح اس کے جسم کی رگوں اور عروق میں پھیلتا گیا۔ رواں دواں، رواں دواں رواں دواں...اس لہر نے اسے بالکل بے بس کر دیا اور وہ ساحل کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔

''آخری رمبا کتنا اچھا تھا!''سنیہہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

اور اس کے ذہن میں پھر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ بنگالی فاقہ مستوں کی قطاریں اندر گھستی چلی آ رہی تھیں۔ وہ انھیں باہر نکالنے کی کوشش میں کامیاب ہوا، بولا:''میں کہتا ہوں سنیہہ ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیے...میرے خیال میں اس کے بعد ہمیں قحط زدہ علاقے کا دورہ کرنا چاہیے کیوں؟''

''بہت دماغی محنت سے کام لے رہے ہو اس وقت۔''سنیہہ نے تشویشناک لہجے میں کہا۔''بیمار ہو جاؤ گے! جانے دو۔ وہ بے چارے تو مر رہے ہیں۔ انہیں آرام سے مرنے دو۔ تم کیوں مفت میں پریشان ہوتے ہو۔''

''قحط زدہ علاقے کا دورہ کروں گا، یہ ٹھیک ہے سنیہہ، تم بھی چلو گی نا؟''

''کہاں؟''

''بنگال کے دیہات میں۔''

''ضرور_ مگر وہاں کس ہوٹل میں ٹھہریں گے؟''

ہوٹل کا ذکر سن کر اس اپنی تجویز کو وہیں اپنے ذہن میں قتل کر ڈالا اور قبر کھود کر وہیں اندر دفنا دیا۔ خدا جانے اس کا ذہن اس قسم کی کتنی ناپختہ تمناؤں اور آرزوؤں کا قبرستان بن چکا تھا۔

وہ بچے کی طرح روٹھا ہوا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار۔

سنیہہ نے کہا:''میں تمہیں بتاؤں۔ ایک شان دار ناچ پارٹی ہو جائے گرانڈ میں۔ دو سو روپیہ فی ٹکٹ اور شراب کے پیسے الگ رہے اور جو رقم اس طرح اکٹھی ہو جائے وہ بنگال ریلیف فنڈ میں....!''

''ارے رررے...''اس نے کرسی سے اُچھل کر سنیہہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔''اے جان تمنا! تمھاری روح کتنی حسین ہے۔''

''جبھی تم نے کل رات آخری رمبا کے بعد مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی۔''سنیہہ نے ہنس کر کہا۔

''اور تم نے کیا جواب دیا تھا؟''اس نے پوچھا۔

''میں نے انکار کر دیا تھا۔''سنیہہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

''بہت اچھا کیا۔'' وہ بولا، ''میں اس وقت شراب کے نشے میں تھا۔''

کار، جیونی رام، میونی رام، پیونی رام، بھوندومل تمبا کوفروش کی دکان پر رکی، سامنے گرانڈ ہوٹل کی عمارت تھی، کسی مغلئی مقبرے کی طرح وسیع اور پرشکوہ!

اُس نے کہا: ''تمھارے لیے کون سے سگریٹ لے لوں!''

''روز، مجھے اُس کی خوشبو پسند ہے۔'' سنیہہ نے کہا۔

''امی دودن کھیتے پائی نی کی چھوکھیتے داؤ۔''

ایک بنگالی لڑکا دھوتی پہنے ہوئے بھیک مانگ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میلی کچیلی، خاک میں اٹی ہوئی، آنکھیں غلیظ اور ادھ مندی۔ سنیہہ نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔

''میم صائب ایکٹا پوئے شاداؤ۔'' لڑکا گڑگڑا رہا تھا۔

''تو میں روز ہی لے آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جیونی رام، میونی رام پیونی رام، بھوندومل تمبا کوفروش کی دکان کے اندر غائب ہو گیا۔

سنیہہ کار میں بیٹھی رہی، لیکن بنگال کی بھوکی مکھیاں اُس کے دماغ میں بھنبھناتی رہیں۔ میم صاحب ...میم صاحب، میم صاحب۔ میم صاحب نے دوایک بار اُنہیں جھڑک دیا۔ لیکن بھوک جھڑکنے سے کہاں دور ہوتی ہے۔ وہ اور بھی قریب آ جاتی ہے۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے اپنے ننھے ننھے ہات سنیہہ کی ساری سے لگا دیے اور اس کا پلو پکڑ کر لجاجت سے کہنے لگی: ''میم صاحب...میم صاحب...میم صائب بوڑکھیدے پیچھ۔ کی چھووا۔''

سنیہہ اب بالکل زچ ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے پلو چھڑا لیا۔ اتنے میں وہ آ گیا۔ سنیہہ بولی: ''یہ گداگر کیوں اس قدر پریشان کرتے ہیں۔ کارپوریشن کوئی انتظام نہیں کر سکتی ہے کیا؟...جب سے تم دکان کے اندر داخل ہوئے...یہ...''

اُس نے گداگر لڑکے کو زور سے چپت لگائی اور چھوٹی لڑکی کو چٹیا سے پکڑ کر زور سے پرے دھکیل دیا اور کردم سے کار گھما کر گرانڈ ہوٹل کے پورچ میں لے آیا۔

بنگالی لڑکی جو اک جھٹکے کے ساتھ دور جا پڑی تھی وہیں فرش خاک پر کراہنے لگی۔ لڑکے نے اپنی چھوٹی بہن کو اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''تمار کو تھا وَلا گے نے تو۔''

لڑکی سسکنے لگی...

ناچ عروج پر تھا۔

سنیہہ اور وہ ایک میز کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔

سنیہہ نے پوچھا: ''کتنے روپے اکٹھے ہوئے۔''

''ساڑھے چھ ہزار!''

''ابھی تو ناچ عروج پر ہے۔صبح چار بجے تک....''

نو ہزار روپیہ ہو جائے گا۔'' وہ بولا۔

''آج تم نے بہت کام کیا ہے!''سنیہہ نے اُس کی اُنگلیوں کو چُھو کر کہا۔

''کیا پیو گی؟''

''تم کیا پیو گے؟''

''جن اور سوڈا۔''

سنیہہ بولی: ''بیرا، صاحب کے لیے ایک لارج جن لاؤ اور سوڈا۔''

''اور تم؟''

''ناچتے ناچتے اور پیتے پیتے پریشان ہو گئی ہوں۔''

''اپنے وطن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے ڈارلنگ۔'' اُس نے سنیہہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اوہ مجھے امپریلزم سے کس قدر نفرت ہے۔''سنیہہ نے پرخلوص لہجے میں کہا۔''بیرا، میرے لیے ایک 'ورجن' لاؤ۔''

بیرے نے 'ورجن' کا جام لا کر سامنے رکھ دیا۔جن کی سپیدی میں ورموتھ کی لالی اس طرح نظر آتی تھی جیسے سنیہہ کے عنبریں چہرے پر اُس کے لبِ لعلیں۔سنیہہ نے جام پلایا اور کاک ٹیل کا رنگ شفقی ہو گیا۔سنیہہ نے جام اُٹھایا اور بجلی کی روشنی نے اُس کے جام میں گھل کر یاقوت کی سی چمک پیدا کر دی۔ یاقوت سنیہہ کی اُنگلیوں میں تھرا رہا تھا۔یاقوت جو خون کی طرح سرخ تھا۔

....ناچ عروج پر تھا اور وہ اور سنیہہ ناچ رہے تھے۔ایک گت، ایک تال، ایک لے، سمندر دور ....بہت دور....کہیں نیچے چلا گیا تھا اور زمین گم ہو گئی تھی اور وہ ہوا میں اُڑ رہے تھے اور سنیہہ کا چہرہ اُس کے

کندے پر تھا اور سنیہہ کے بالوں میں بسی ہوئی خوشبو اُسے بلا رہی تھی۔ بال بنانے کا انداز کوئی سنیہہ سے سیکھے۔ یہ عام ہندوستانی لڑکیاں تو بیچ میں سے یا ایک طرف سے مانگ نکال لیتی ہیں اور تیل چپڑ کر بالوں میں کنگھی کر لیتی ہیں۔ بہت ہوا تو دو چوٹیاں کر ڈالیں اور اپنی دانست میں فیشن کی شہزادی بن بیٹھیں۔ مگر یہ سنیہہ ہی جانتی ہے کہ بالوں کی ایک الگ ہستی ہوتی ہے۔ اُن کا اپنا حسن ہوتا ہے۔ اُن کی مشاطگی عورت کی نسائیت کی معراج ہے۔ جیسے کوئی مصور سادہ تختے پر حسن کے نازک خطوط کھینچتا ہے اُسی طرح سنیہہ بھی اپنے بال سنوارتی تھی۔ کبھی اُس کے بالوں میں کنول کے پھول بن جاتے، کبھی کانوں پر ناگن کے پھن۔ وہ کبھی چاند کا ہالہ ہو جاتے، کبھی ان بالوں میں ہمالیہ کی وادیوں کے سے نشیب و فراز پیدا ہو جاتے۔ سنیہہ اپنے بالوں کی آرائش میں ایسے جمالیاتی ذوق اور جودتِ طبع کا ثبوت دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا سنیہہ کی عقل اُس کے دماغ میں نہیں، اُس کے بالوں میں ہے!...

ناچ عروج پر تھا اور یہ بال اس کے رخساروں سے مس ہو رہے تھے۔ اس کے رگ و پے میں رقص کی روانی تھی اور اُس کے نتھنوں میں اُس خوشبو کا تعطر۔ اُس کا جسم اور سنیہہ کا جسم پگھل کر ایک ہو گئے تھے اور ایک شعلے کی طرح ساز کی دہن پر لہرا رہے تھے۔ ایک شعلہ، ایک پھن، ایک زہر... ایک لہر... لہریں ...لہریں ہلکی ہلکی، گرم مدّ ورسی لہریں ساحل کو چومتی ہوئی، لوریاں دے کر تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی، سو جاؤ، موت میں زندگی ہے۔ حرکت نہ کرو۔ سکون میں زندگی ہے، آزادی نہ طلب کرو، غلامی ہی زندگی ہے۔ چاروں طرف ہال میں ایک میٹھا سا زہر بسا ہوا تھا۔ شراب میں... عورت میں... ناچ میں ...سنیہہ کے نیلے سائے میں، اُس کے پراسرار تبسم میں، اُس کے نیم وا لبوں کے اندر کانپتی ہوئی موتیوں کی لڑی میں زہر... زہر اور نیند اور سنیہہ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے، بند ہوتے لب، اور نغمے کا زہر، سو جاؤ ...سو جاؤ... یکا یک ہال میں بجلی بجھ گئی اور وہ سنیہہ کے ہونٹوں سے ہونٹ ملائے، اُس کے جسم سے جسم لگائے، مدہم مدہم، دھیمے دھیمے، ہولے ہولے ناچ کے جھولے میں گہرے، گداز، گرم آغوش میں کھو گیا، بہہ گیا، سو گیا، مر گیا...!

وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے

''....میں مر چکا ہوں؟ میں زندہ ہوں؟....میری پھٹی پھٹی بے نور، بے بصر آنکھیں آسمان کی پہنائیوں میں کسے ڈھونڈ رہی ہیں؟ آؤ پل بھر کے لیے اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاؤ اور میری سنتے

جاؤ، جب تک پولیس، سیوا استمی یا انجمن خدام المسلمین میری لاش کو یہاں سے اُٹھا نہ لے جائیں۔تم میری داستان سن لو،نفرت سے منہ نہ پھیرو۔میں بھی تمہاری طرح گوشت کم اور پوست کا بنا ہوا انسان ہوں۔یہ سچ ہے کہ اب میرے جسم پر گوشت کم اور پوست زیادہ نظر آتا ہے اور اس میں بھی سڑانڈ پیدا ہو رہی ہے اور ناک سے پانی کے بلبلے سے اُٹھ رہے ہیں۔لیکن یہ تو سائنس کا ایک معمولی سا عملیہ ہے۔تمھارے جسم اور میرے جسم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے دل کی حرکت بند ہوگئی ہے، دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور پیٹ ابھی تک بھوکا ہے یعنی اب بھی اس قدر بھوکا ہے کہ میں سوچتا ہوں، اگر تم چانول کا ایک دانہ میرے پیٹ میں رکھ دو تو وہ پھر سے کام کرنا شروع کر دے گا۔ آزما کر دیکھ لو، کدھر چلے؟ ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو، نہ جاؤ، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔تم گھبرا گئے، کلکتے کے مردے بھی بھیک مانگتے ہیں۔خدا کے لیے نہ جاؤ۔میری داستان سن لو، ہاں، ہاں اس چانول کے دانے کو اپنی مٹھی میں سنبھال کر رکھو۔میں اب تم سے بھیک نہیں طلب کروں گا، کیونکہ میرا جسم اب گل چکا ہے، اسے چانولوں کے دانے کی ضرورت نہیں رہی۔اب یہ خود ایک دن چانول کا دانہ بن جائے گا۔نرم نرم گداز مٹی میں جس کے ہر مسام میں ندی کا پانی رچا ہوگا۔یہ جسم گھل جائے گا۔اپنے اندر دھان کی پنیری کو اُگتے ہوئے دیکھے گا اور پھر یہ ایک دن پانی کی پتلی تہہ سے اوپر سر نکال کر اپنے سبز سبز خوشوں کو ہوا میں لہرائے گا، مسکرائے گا، ہنسے گا، کھلکھلانے گا، کرنوں سے کھیلے گا، چاندنی میں نہائے گا، پرندوں کے چہچہوں اور خنک ہوا کے جھونکوں کے شہد آگیں بوسوں سے اس کی حیات کے بند بند میں اک نئی رعنائی، اک نیا حسن، اک نیا نغمہ پیدا ہوگا۔ چانول کا ایک دانہ... ہر خوشے کے دھان کے خول میں چانول کا یک دانہ وہ ہوگا۔صدف کے موتی کی طرح اُجلا، معصوم اور خوبصورت....آج میں تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں، دنیا کا سب سے بڑا راز، وہ راز جو تمھیں ایک مردہ ہی بتا سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا سے دعا کرو، وہ تمھیں انسان نہ بنائے، چانول کا ایک دانہ بنا دے۔اُس خالق باری کے سامنے گڑگڑاؤ، منتیں کرو، دعا مانگو، فاقے کرو، چلّہ کاٹو، جس طرح ہو سکتے یہ کوشش کرو وہ تمھیں انسان نہ بنائے، چانول کا ایک دانہ بنا دے، گو زندگی انسان میں بھی ہے اور چانول کے دانے میں بھی، لیکن جو زندگی چانول کے دانے میں ہے وہ انسان کی زندگی سے کہیں بہتر ہے، معصوم ہے، خوبصورت ہے، پاک ہے۔اور انسان کے پاس بھی اس زندگی کے سوا اور ہے کیا؟ انسان کی جائداد، اس کا جسم، اس کا باغ، اس کا گھر نہیں بلکہ یہی اُس کی زندگی ہے۔اس کا اپنا آپ، وہ ان سب

چیزوں کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے۔ اپنے جسم کو، اپنی زمین کو، اپنے گھر کو، اُس کے دل میں چند تصویریں ہوتی ہیں، چند خیال، آگ کے چند انگارے، ایک مسکراہٹ، وہ انہیں پر جیتا ہے اور جب مرجاتا ہے تو صرف انہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

چانول کے دانے کی زندگی تم دیکھ چکے۔ اب آؤ، میں تمھیں اپنی زندگی دکھاؤں۔ نفرت سے منہ نہ پھیرلو، کیا ہوا اگر میرا جسم مردہ ہے، میری روح تو زندہ ہے، میری روح تو بیدار ہے اور پیشتر اس کے کہ وہ بھی سوجائے وہ تمھیں ان چند دنوں کی کہانی سنانا چاہتی ہے جب روح اور جسم ایک ساتھ چلتے پھرتے، ناچتے گاتے، ہنستے بولتے تھے۔ روح اور جسم، دو میں مزا ہے، دو میں حرکت ہے، دو میں زندگی ہے، دو میں تخلیق ہے۔ جب دھرتی اور پانی ملتے ہیں تو چانول کا دانہ پیدا ہوتا ہے۔ جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو اک خوبصورت ہنستا ہوا بچہ ظہور میں آتا ہے۔ جب روح اور جسم ملتے ہیں تو زندگی پیدا ہوتی ہے۔ آؤ میں تمھیں اپنے دو کی داستان سناؤں، وہ دو جو اب الگ ہو چکے۔ روح اور جسم، دونوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ جب جسم الگ ہوجاتا ہے تو اُس میں سڑانڈ پیدا ہوتی ہے اور جب روح الگ ہوتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے۔ اگر غور سے دیکھو گے تو تمھیں اس دھوئیں میں میرے ماضی کی تصاویر لرزتی، دمکتی، گم ہوتی ہوئی نظر آئیں گی... یہ تجلی کیا تھی... یہ میری بیوی کی مسکراہٹ تھی... یہ میری بیوی ہے... شرماؤ نہیں، سامنے آجاؤ، اے جان تمنا؟... اسے دیکھا آپ نے؟ یہ سانولی سانولی مورت، یہ گھنے بال کمر تک لہراتے ہوئے، یہ شرمیلا تبسم، یہ جھکی جھکی حیران آنکھیں یہ آج سے تین سال پہلے کی لڑکی ہے، جب میں نے اسے اتاپارا کے ساحلی گاؤں میں سمندر کے کنارے دوپہر کی سوئی ہوئی فضا میں دیکھا تھا .... میں ان دنوں اجات قصبے میں زمیندار کی لڑکی کو ستار سکھاتا تھا اور یہاں اتاپارا میں دو دن کی چھٹی لے کر اپنی بڑی موسی سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ یہ خاموش گاؤں سمندر کے کنارے، بانسوں کے جھنڈ اور ناریل کے درختوں سے گھرا ہوا اپنی اداسی میں گم تھا۔ نہ جانے ہمارے بنگالی گاؤں میں اتنی اُداسی کہاں سے آجاتی ہے۔ دھرتی خاموش ہے، سامنے سمندر، اتھاہ سمندر پھیلا ہوا ہے، فضا رکی ہوئی ہے، بانس کے چھپروں کے اندر اندھیرا ہے، سیلن ہے، بانس کی ہانڈیوں میں چانول دبے بڑے ہیں، مچھلی کی 'بو ہے'، تالاب کا پانی کائی سے سبز ہے، دھان کے کھیتوں میں پانی ٹھہرا ہوا ہے، ناریل کا درخت اک نکیلی برچھی کی طرح آسمان کے سینے میں گہرا گھاؤ ڈالے کھڑا ہے۔ ہر جگہ، ہر وقت درد کا احساس ہے،

ٹھہراؤ کا احساس ہے، حزن کا احساس ہے، سکون، جمود اور موت کا احساس ہے۔ یہ اُداسی جو تم ہماری محبت ہمارے سماج، ہمارے ادب اور نغمے میں دیکھتے ہو، یہ اُداسی ہمارے گاؤں سے شروع ہوتی ہے اور پھر ساری دھرتی پر پھیل جاتی ہے۔

جب میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو یہ مجھے اک جل پری کی طرح حسین نظر آئی۔ یہ اُس وقت پانی میں تیر رہی تھی اور میں ساحل کی ریت پر ٹہل رہا تھا اور اک نئی دہن میں سوچ رہا تھا۔ یکا یک میرے کانوں میں اک شیریں نسوانی آواز آئی: ''پرے ہٹ جاؤ، میں کنارے پر آنا چاہتی ہوں۔'' میں نے دیکھا آواز سمندر میں سے آرہی تھی۔ لانبے ریشمیں گھنے بال، اور جل پری کا چہرہ ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا اور دور پرے اُفق پر ایک کشتی جس کا مٹیالا بادبان دھوپ میں سونے کے پترے کی طرح چمکتا نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا: ''کیا تم سات سمندر پار سے آئی ہو؟''

وہ ہنس کر بولی: ''نہیں میں تو اسی گاؤں میں رہتی ہوں۔ وہ کشتی میرے باپ کی ہے، وہ مچھلیاں پکڑ رہا ہے، میں اُس کے لیے کھانا لائی ہوں... ذرا دیکھ کر چلو۔ تمھارے قریب ناریل کے تنے کے پاس کھانا رکھا ہے اور وہاں میری ساڑھی بھی ہے۔''

یہ کہہ کر اُس نے پانی میں ایک ڈبکی لگائی اور پھر لہروں میں پھوٹتے ہوئے بلبلوں کی افشاں سی بناتی ہوئی کنارے کے قریب آ گئی۔ بولی: ''پرے ہٹ جاؤ اور وہ دھوتی مجھے دے دو۔''

میں نے کہا: ''ایک شرط پر۔''

''کیا ہے!''

''میں بھی مچھلی بھات کھاؤں گا۔ بہت بھوک لگی ہے۔''

وہ ہنسی، اور پھر سن سے ایک تیر کی طرح پانی کے سینے کو چیرتی ہوئی دور چلی گئی۔ جہاں اُس کے چاروں طرف سورج کی کرنوں نے پانی میں طلائی جال بُن رکھا تھا اور اس کا نازک، چھریرا، سبک اندام جسم اک نئی کشتی کی طرح اُن پانیوں میں گھومتا نظر آیا، پھر وہ گھومی اور سیدھی کنارے کو ہولی۔ لیکن اب ہولے ہولے آرہی تھی، آہستہ آہستہ، ڈگمگ ڈگمگ....

میں نے پوچھا: ''کیا ہوا ہے تمھیں؟''

بولی: ''آج کل بھات بہت مہنگا ہے۔ روپے کا دو سیر ہے۔ میں تمھیں بھات نہیں کھلا سکتی۔''

''پھر، میں کیا کروں، مجھے تو بھوک....''

''سمندر کا پانی پیو۔''اس نے شوخی سے کہا اور پھر ایک ڈبکی لگائی۔

جب وہ میری بیوی بن کر میرے گھر آئی تو بھات روپے کا دو سیر تھا اور میری تنخواہ پچاس روپے ماہانہ تھی۔ بیاہ سے پہلے مجھے خود صبح اُٹھ کر بھات پکانا پڑتا تھا کیونکہ زمیندار کی بیٹی سکول جاتی تھی اور مجھے علی الصبح اسے ستار سکھانے کے لیے جانا پڑتا۔ شام کو بھی اسے دو گھنٹے تک ریاض کراتا تھا۔ دن میں بھی زمیندار بلا لیتا تھا: ''ستار سناؤ جی۔ جی بہت اُداس ہے!''

پھر یہ ننھی سی بچی ہمارے ہاں آ گئی....ادھر آؤ بیٹا.... ہاں مسکرا دو۔ ہنس پڑو۔ ان سے کہہ دو میں بالکل معصوم ہوں، انجان ہوں، میری عمر دو سال کی بھی نہیں اور مجھے جھنجھنا بجانے، گڑیا سے کھیلنے اور ماں کی چھاتی سے لگ کر دودھ پینے اور دودھ پیتے پیتے اس کے سینے سے اپنے ننھے منے ہاتھ چمٹائے اس کے گداز آغوش میں سو جانے کا بہت شوق ہے۔ میں اتنی پاکیزہ ہوں کہ خود بول بھی نہیں سکتی، بات بھی نہیں کرتی، صرف مڑ مڑ تکتی ہوں، اُس آسمان کی طرف جس کے مالک نے مجھے اس زمین پر بھیجا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے دل میں انسانی مسرت کی کرن بن کر رہوں اور اور بانس کی میلی سیلی چھپریا میں خوشی کا گیت بن کر گھر کے آنگن کو اپنی ہنسی کے نور سے بھر دوں... مسکرا دو بیٹا!

... ہاں تو جب یہ ننھی سی بچی پیدا ہوئی، اس وقت بھات روپے کا ایک سیر تھا لیکن ہم لوگ اس پر بھی خدا کا شکر بجالاتے تھے جس نے چانول کے دانے بنائے اور زمیندار کے پاؤں چومتے تھے جس نے ہمیں چانول کے دانے کھلائے اور سچ بات تو یہ ہے کہ بنانے اور کھانے کے بیچ میں جو چیز حائل ہے، وہ بجائے خود اک پوری تاریخ ہے۔ انسانی زندگی کے ہزاروں سال کی داستان ہے۔ اس کی تہذیب وتمدن، مذہب، اوہام، فلسفے اور ادب کی تفسیر ہے۔ بنانا اور کھانا بہت سہل الفاظ ہیں لیکن ذرا اس گہری خلیج کو بھی دیکھیے جو ان دو لفظوں کے درمیان حائل ہے۔

بھات روپے کا ایک سیر تھا۔

پھر بھات روپے کا تین پاؤ ہوا۔

پھر بھات روپے کا آدھ سیر ہوا۔

پھر بھات روپے کا ایک پاؤ ہوا۔

اور پھر بھات_ معدوم ہو گیا۔

پھر درختوں پر سے آم، جامن، کٹیل، شریفے، کیلے ختم ہو گئے۔ تاڑی ختم، ساگ سبزی ختم، مچھلی ختم، ناریل ختم۔ کہتے ہیں زمیندار کے پاس منوں اناج تھا اور بنیے کے پاس بھی، لیکن کہاں تھا؟ کس جگہ تھا؟ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اناج حاصل کرنے کی سب تدبیریں رائیگاں گئیں۔ گڑگڑانا، منتیں کرنا، خدا سے دعا مانگنا، خدا کو دھمکی دینا سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف اللہ کا نام باقی تھا یا زمیندار اور بنیے کا گھر۔

اناج کی گرانی دیکھ کر زمیندار نے میرا ستار سکھانا بند کر دیا۔ جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں اس وقت نغمے کی کسے سوجھتی ہے۔ پچاس روپے دے کر ستار کون سیکھتا ہے!

بھوک، نا اُمیدی اور بلکتی ہوئی بچی!

میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''ہم کلکتے چلیں گے، وہاں لاکھوں لوگ بستے ہیں شاید وہاں کوئی کام چل جائے!''

''چلو کلکتے چلو!''

'چلو کلکتے چلو!' جیسے یہ صدا سارے گاؤں والوں نے سن لی۔ گاؤں کی سماجی زندگی اک بند کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ یکا یک 'چلو کلکتے چلو' کی صدا نے اس بند کا ایک کنارہ توڑ دیا سارا گاؤں اس سوراخ کے راستے سے بہہ نکلا... چلو کلکتے چلو.... ہر لب پر یہی صدا تھی... چلو کلکتے چلو...!''

سنیکڑوں، ہزاروں آدمی اس سڑک پر چل رہے تھے، یہ سڑک جو کلکتے کے مضافات میں سے بنگال کے دور دور پھیلے ہوئے گاؤں میں سے گھومتی ہوئی آ رہی تھی، یہ سڑک جوان انسانوں کے لیے شاہ رگ کی طرح تھی... چلو کلکتے چلو... چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ خاک وخون میں اٹی ہوئی لتھڑی ہوئی اور کلکتے کی لاش کی طرف جا رہی تھیں، ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں۔ اور اس قافلے کے اُوپر گدھ گھوم رہے تھے اور ساری فضا میں مردہ گوشت کی بُو تھی۔ چیخیں تھیں فضا میں، آہ بکا اور آنسوؤں کی سیلن، اور لاشیں جو سڑک پر طاعون زدہ چوہوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ لاشیں جنھیں گدھوں نے کھا لیا تھا اور اب ان کی ہڈیاں دھوپ میں چمکتی نظر آتی تھیں۔ لاشیں جنہیں گیدڑوں نے کھا لیا تھا، لاشیں جنہیں کتے ابھی تک کھا رہے تھے۔ لیکن چیونٹیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ چیونٹیاں بنگال کے ہر حصے سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ اور ان کے ذہن میں کلکتے کی لاش تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال کیسے ہوتا۔ ان لاکھوں آدمیوں میں سے ہر

شخص اپنے لیے لڑ رہا، مر رہا تھا۔ جی رہا تھا، موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ شاید ایسا ہی ہونا تھا۔ ان لوگوں کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ ان ہزاروں لاکھوں چیونٹیوں کی موت۔ پیٹ میں بھوک کا دوزخ اور آنکھوں میں یاسیت کی مہیب تاریکی لیے یہ انسانی چیونٹیاں اپنے بوجھل قدموں سے سڑک پر چل رہی تھیں، لڑ رہی تھیں، کراہ رہی تھیں، مر رہی تھیں۔ کاش ان انسانوں میں چیونٹیوں کا سا ہی نظم ونسق ہوتا تو بھی یہ صورت حال نہ ہوتی۔ چیونٹیاں اور چوہے بھی اس بری طرح نہیں مرتے....!

راستے میں کہیں خیرات بھی مل جاتی تھی۔ ہندو، ہندوؤں کو اور مسلمان، مسلمانوں کو خیرات دیتے تھے۔ لیکن خیرات سے کب کسی کا پیٹ بھرتا ہے۔ خیرات تو زندگی عطا نہیں کرتی۔ خیرات ہمیشہ دھوکا دیتی ہے۔ خیرات کرنے والے کو بھی خیرات لینے والے کو بھی۔ ہمیں بھی خیرات ملی اور ایک دن ایک سالم ناریل ہاتھ لگ گیا۔ بچی کب سے دودھ کے لیے چلاّ رہی تھی۔ اور ماں کی چھاتیاں اس دھرتی کی طرح تھیں، جس پر مدت سے پانی کی اک بوند نہ برسی ہو۔ اس کا پھول کا سا جسم جھلس گیا تھا۔ وہ بار بار بچی کو پچکارنے کے لیے اُس کے ہاتھ میں جھنجھنا دے دیتی۔ بچی کو یہ جھنجھنا بہت پسند تھا۔ وہ اُسے ہر وقت کلیجے سے لگائے رکھتی۔ اس وقت بھی وہ اس جھنجھنے کو زور سے اپنی مٹھی میں دبائے اپنی ماں کے شانے سے لگی بلک رہی تھی اور روئے جاتی تھی۔ جیسے کوئی بے بس زخمی جانور برابر چیخے جاتا ہے اور جب تک اُسے موت نہیں آتی، برابر اُسی، طرح، اُسی انداز میں، اُسی لے میں بین کیے جاتا ہے...لیکن اچھا ہوا۔ عین اُسی روز ہمیں ایک سالم ناریل مل گیا۔ ناریل کا دودھ ہم نے بچی کو پلایا اور ناریل ہم دونوں نے کھایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سارا جہاں جی اُٹھا ہو!

اب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ سب تجارت ختم ہو چکی تھی۔ صرف گوشت و پوست کی تجارت ہو رہی تھی۔ اُس کے تاجر شمالی ہندو سے آتے تھے۔ ان میں یتیم خانوں کے مینیجر تھے، جنہیں یتیموں کی تلاش تھی۔ ماں باپ اپنے ننھے منھے بچے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے اُن کے حوالے کر کے انہیں یتیم بنا رہے تھے۔ دراصل غربت ہی تو یتیم پیدا کرتی ہے۔ ماں باپ کا زندہ رہنا یا مر جانا ایک خدائی امر ہے۔ ان تاجروں میں ودھوا آشرموں کا کارکن بھی تھے اور خالص تاجر، جو ہر قسم کی اخلاقی، مذہبی، تمدنی ریاکاری سے الگ ہو کر خالص تجارت کرتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بکریوں کی ٹٹولی جاتی تھیں۔

ماں اچھا ہے۔

رنگ کالا ہے۔

ذرا دبلی ہے۔

منہ پر چیچک ہے۔

ارے اس کی تو بالکل ہڈیاں نکل آئی ہیں۔

چلو، خیر، ٹھیک ہے۔

دس روپے دے دو۔

خاوند بیویوں کو، مائیں لڑکیوں کو، بھائی بہنوں کو فروخت کر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اگر کھاتے پیتے ہوتے تو ان تاجروں کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے، لیکن اب یہی لوگ نہ صرف انہیں بیچ رہے تھے بلکہ بیچتے وقت خوشامد بھی کرتے تھے۔ دکانداروں کی طرح اپنے مال کی تعریف کرتے، گڑگڑاتے، جھگڑا کرتے، ایک ایک پیسہ کے لیے مر رہے تھے! مذہب، اخلاقیات، روحانیت، مامتا، زندگی کی قوی سے قوی تریں جذبوں کے چھلکے اُتر گئے تھے۔ اور ننگی بھوکی پیاسی خونخوار زندگی منہ پھاڑے سامنے کھڑی تھی۔

میری بیوی نے کہا: ''ہم بھی اپنی بچی بیچ دیں۔''

ڈرتے ڈرتے، شرمندہ، محجوب سی ہو کر اُس نے یہ الفاظ کہے اور پھر فوراً ہی چپ ہو گئی۔ اُس نے کنکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ اپنے الفاظ کے تازیانوں کا اثر دیکھ رہی ہو، اُس کی نگاہوں میں اک ایسا احساس جرم تھا جیسے اُس نے اپنے ہاتوں سے اپنی بچی کا گلا گھونٹ ڈالا ہو، جیسے اُس نے اپنے خاوند کو ننگا کر کے اُس کے بدن پر کوڑے لگائے ہوں، جیسے اُس نے خود اپنے ہاتوں سے پھانسی کا پھندا تیار کیا ہوا اور اب اُس کی دبلی پتلی گردن اس میں لٹک رہی ہو۔

مجھے یہ گلہ نہیں کہ وہ کیوں مر گئی۔ مرنے کو تو وہ اُسی وقت مر گئی تھی۔ جس وقت اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شاید ان الفاظ کے زبان تک آنے سے بہت عرصہ پہلے ہی وہ مر چکی تھی۔ لیکن اب بھی سمجھ میں نہیں آتا، مر کر بھی سمجھ میں نہیں آتا، غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا، اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کیسے، یہ کیونکر ہوا، کس بھیانک قوت نے اس کی مامتا کو مار دیا تھا، اس کی روح کو کچل دیا تھا۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا، مجھے اس کے مر جانے کا مطلق افسوس نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس کی مامتا کیوں مر گئی۔ وہ مامتا جسے

ہم سب لازوال کہتے ہیں.... مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اس وقت اپنی بچی کو چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا تھا... میں نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اسی طرح لاتعلقی کے انداز میں میرے غم و غصے کو نظر انداز کرتی ہوئی لنگڑاتی ہوئی، میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ کولہو کے اندھے بیل کی طرح اس کے پریشان بال دھول میں اٹے ہوئے تھے، جسم پر دھوتی تار تار ہو چکی تھی۔ دائیں باؤں کے زخم سے خون رستا تھا اور وہ آنکھیں.... ہائے وہ جل پری کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ سمندر میں طلائی مچھلی کی طرح تیرنے والی سبک اندام بنگالی دوشیزہ ...وہ پھول کا سا حسن، جس میں تاج کا مرمر، ایلورا کے مندروں کی رعنائی اور اشوک کے کتبوں کی ابدیت گھلی ہوئی تھی آج کدھر غائب ہو گیا تھا؟ کس لیے یہ حسن، یہ مامتا، یہ روح اس سڑک پر اک روندی ہوئی لاش کی طرح پڑی تھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ عورت ایک اعتقاد ہے، ایک معجزہ ہے، زندگی کی سچائی ہے، اس کی منزل، اس کا مستقبل، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اعتقاد، یہ سچائی، یہ معجزہ، چانول کے ایک دانے سے اُگتا ہے اور اس کے نہ ہونے سے مر جاتا ہے!

جل پری نے میری گود میں دم توڑ دیا۔ وہ تھکی ماندی، خاک میں اٹی ہوئی اُسی سڑک کنارے سو گئی، مری آغوش میں، دو تین ہچکیاں اور سانس غائب ...نہ جانے میرے احساسات کیوں مجھے اس لمحے کی طرف گھسیٹ کر لے گئے جب میں نے پہلی بار اُس کے ہونٹوں کو چوما تھا اور اس کی مہکی ہوئی سانس نے مجھے سگندھ راج کے پھولوں کی یاد دلائی تھی۔ اس وقت بھی وہی سگندھ راج کے پھولوں کی مہک تیزی سے میرے نتھنوں میں گھستی چلی آئی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں اس کے مردہ لبوں کی طرف تکنے لگا اور میرے آنسو اس کے لبوں پر، اس کی آنکھوں پر، اس کے رخساروں پر گرنے لگے۔ وہ میری گود میں مری پڑی تھی۔ جل پری جو اُنیس سال کی عمر میں مر گئی۔ خاک میں اٹی ہوئی، ننگی، بھوکی، پیاسی جل پری چڑیل بن کر مر گئی۔ مجھے موت سے کوئی شکوہ نہیں، اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں، زندگی سے، سڑک پر گذرتے ہوئے اندھے قافلے سے، کسی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ صرف یہی جی چاہتا تھا کہ وہ اس طرح نہ مر جاتی۔ میں اک بندے کی طرح نہیں، اک دوست کی طرح اپنے خداؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں: اس میں کیا برائی تھی اگر وہ زندہ رہتی، اک طبعی عمر بسر کرتی، اُس کا اک چھوٹا سا گھر ہوتا، اس کے بال بچے ہوتے، وہ اُن کی پرورش کرتی، اُسے اپنے خاوند کی محبت میسر ہوتی، اک عام اوسط زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں، دنیا کروڑوں ایسے معمولی چھوٹے آدمیوں سے بھری پڑی ہے جو زندگی سے ان چھوٹی چھوٹی

مسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ نہ سلطنت نہ شہرت، نہ فرشتہ پن، پھر بھی اُسے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل نہ ہوئیں۔ وہ کیوں اس طرح مرگئی اور اگر اسے مرنا تھا تو وہ ساحل، سمندر اور ناریل کے جھنڈ کو دیکھ کر ہی مرتی۔ یہ کیسی موت ہے کہ ہر طرف ویرانی ہے اور لاشیں ہیں اور خلا ہے اور آہ و بکا ہے، سڑک کی خاک ہے اور چپ چاپ چلتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے اور دور کہیں کتّے رو رہے ہیں....!

میں نے اُسے دفن نہیں کیا، میں نے اُسے جلایا بھی نہیں، میں نے اُسے وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ دیا اور اپنی بچی کو چھاتی سے چمٹائے آگے بڑھ گیا۔

ابھی کلکتہ دور تھا اور میری بچی بھی بھوکی تھی۔ وہ اب رو نہ سکتی تھی۔ اُس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ بار بار اپنا منہ ایسے کھولتی جیسے مچھلی جل سے باہر نکل کر پانی کے گھونٹ کے لیے اپنے ہونٹ وا کرتی۔ ہائے یہ ننھی سی جل پری اپنے چھوٹے سے کھلونے کو سینے سے چمٹائے ایک گھلتی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی تھی، بجھ رہی تھی اور میں چلا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد، آمنے سامنے، آگے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ رواں دواں، مردوں کا قافلہ۔ ہر اک کی اپنی دنیا تھی لیکن ہر فرد اُسی موت کی وادی میں سے گزر رہا تھا اور آنکھوں میں، چہروں پر، جسموں پر اسی مہیب طاقت کا سایا منڈلا رہا تھا جو اس وادی کی خالق تھی۔ میں ہات جوڑ کر دعا مانگنے لگا...اے خالق ارض وسما اس معصوم بچی کی طرف دیکھ...کیا تیرے دربار میں اس کے لیے دودھ کی ایک بوند بھی نہیں۔ ان داتا...دیکھ یہ کس طرح بار بار منہ کھولتی ہے، بے قرار ہوتی ہے اور تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ اے خداوند لایزال، تو نے خوبصورت موت بنائی ہے۔ لیکن یہ موت تو خوبصورت نہیں، یہ موت تو معصوم نہیں، یہ موت تو اس ننھی سی جان کے لائق نہیں...سن لے کائنات کی پراسرار مخفی قوت عظیم...**اے خداؤں کے ظالم صدرِ اعظم**...تو اس خوبصورت کلی کو ابھی سے کیوں کچل کر رکھ دینا چاہتا ہے، اس کی تمناؤں کی دنیاؤں کو دیکھ...سمندر میں بلبلوں کی افشاں، سبک خرام کشتی، اک نغمہ اپنے معراج کو پہنچا ہوا، ناریل کے جھنڈ میں عورت اور مرد کا پہلا بوسہ...کمینے، سفلے، رذیل!

لیکن نہ دعائیں کام آئیں نہ گالیاں اور میری بچی مرگئی۔ کس طرح تڑپ تڑپ کر اس نے جان دی، اس کا کرب اور اندوہ میری ان پتھریلی ساکن و جامد، بے نور، بے بصر آنکھوں سے پوچھو۔ وہ دودھ کی اک بوند کے لیے مرگئی۔ وہ بوند جو نہ آسمان سے برسی، نہ زمین نے اُگلی، بے حس آسمان، بے حس زمین اور یہ ظالم سڑک!...

مرنے سے کچھ عرصہ پہلے میری بچی نے اپنا پیارا جھنجھنا مجھے دے دیا۔ دیکھو اب بھی میری مٹھی میں ہے۔ یہ امانت اس نے میرے حوالے کی تھی۔ نہیں نہیں، یہ جھنجھنا اس نے مجھے بخش دیا تھا۔ لاپرواہی کے ساتھ، اک ایسے معصومانہ انداز میں اس نے اسے میرے حوالے کر دیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اُس نے مجھے بخش دیا، مجھے معاف کر دیا ہے۔ مجھے اپنے لطف وعنایت سے مالا مال کر دیا ہے۔ اُس نے وہ جھنجھنا میرے ہات میں دے دیا اور پھر میری گود میں مر گئی۔ یہ ایک لکڑی کا جھنجھنا ہے، لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر وہ کلوپیٹرا ہوتی تو اپنی محبت بخش دیتی، اگر وکٹوریہ ہوتی تو اپنی سلطنت میرے سپرد کر دیتی، اگر ممتاز محل ہوتی تو تاج محل میرے حوالے کر دیتی۔ لیکن وہ تو ایک غریب ننھی سی لڑکی تھی اور اس کے پاس صرف یہی ایک لکڑی کا چھوٹا سا جھنجھنا تھا جو اس نے اپنے غریب نادار ابا کے حوالے کر دیا۔ تم میں سے کون ایسا جوہری ہے جو اس لکڑی کے جھنجھنے کی قیمت کا اندازہ کر سکے۔ بڑے آدمیوں کی قربانیوں پر واہ واہ کرنے والو، لے جاؤ اس لکڑی کے جھنجھنے کو، اور انسانیت کے اس معبد میں رکھ دو جو آج سے ہزاروں سال بعد میری روح تمہارے لیے تعمیر کرے گی...!!

آخر کلکتہ آ گیا، بھوکی ویران بستی سنگدل بے رحم شہر کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں، کہیں روٹی کا لقمہ تک نہیں، سیالدہ سٹیشن، شیام بازار، بڑا بازار، ہریسن روڈ، ذکریا اسٹریٹ، بو بازار، سونا گاچی، نیو مارکیٹ، بھوانی پور، کہیں چانول کا ایک دانہ نہیں، کہیں وہ نگاہ نہیں جو انسان کو انسان سمجھتی ہے۔

ہوٹلوں کے باہر بھوکے مرے پڑے ہیں۔ چھوٹی پتیلیوں میں کتے اور انسان ایک جگہ کھانا ٹٹول رہے ہیں، کتے اور آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک موٹر فراٹے سے گزر جاتی ہے۔

ننگے بدن میں پسلیاں آہنی زنجیریں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر روح کو کیوں قید کر رکھا ہے، اسے اُڑ جانے دو۔ اس مہیب زنداں خانے کا دروازہ کھول دو...ایک موٹر فراٹے سے گزر جاتی ہے۔

لیکن جسم روح کی فریاد نہیں سنتا...مائیں مر رہی ہیں، بچے بھیک مانگ رہے ہیں، بیوی مر رہی ہے، خاوند رکشا والے صاحب کی خوشامد کرتا ہے۔ یہ نوجوان عورت مادرزاد ننگی ہے۔ اسے یہ پتہ نہیں، وہ جوان ہے، وہ عورت ہے۔ وہ صرف یہ جانتی ہے کہ وہ بھوکی ہے اور یہ کلکتہ ہے...بھوک نے حسن کو بھی ختم کر دیا ہے!

میں اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر مر رہا ہوں۔ بے ہوش سا پڑا ہوں۔ چند لوگ آتے

ہیں، میرے سرہانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے گویا مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہے ہیں۔ پھر میرے کانوں میں اک مدہم سی آواز آتی ہے، جیسے کوئی کہہ رہا ہے:

''حرامی ہندو ہوگا، جانے دو، آگے بڑھو۔''

وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔اندھیرا بڑھ جاتا ہے...

پھر چند لوگ رکتے ہیں۔کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے...''تم کون ہو؟''

میں بمشکل اپنے بھاری پپوٹے اُٹھا کر آنکھیں کھول کر جواب دیتا ہوں:''میں ایک آدمی ہوں، بھوکا ہوں۔''

وہ یہ کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں:''سالا کوئی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔''

بھوک نے مذہب کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اب چاروں طرف اندھیرا ہے۔مکمل تاریکی، روشنی کی ایک کرن نہیں۔

خاموشی، گہرا سناٹا!

یکا یک کلیساؤں میں، مندروں میں، عبادت خانوں میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ساری کائنات شیریں آوازوں سے معمور ہو جاتی ہے۔

ایک اخبار فروش چلا چلا کر کہہ رہا ہے:''طہران میں بنی نوع انسان کے تین بڑے رہنماؤں کا اعلان، اک نئی دنیا کی تعمیر...!''

اک نئی دنیا کی تعمیر!!

میری آنکھیں حیرت اور مسرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔احساسات پتھر کی طرح جامد ہو جاتے ہیں۔

میری آنکھیں اُس وقت سے کھلی کی کھلی ہیں۔

میں سیاستدان نہیں ہوں، ستار بجانے والا ہوں۔حاکم نہیں ہوں، حکم بجالانے والا ہوں۔لیکن شاید ایک نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں کیا اُن کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی ہاتھ ہوگا جو دنیا میں بستے ہیں۔میں یہ سوال اس لیے پوچھتا ہوں کہ میں بھی ان تین بڑے رہنماؤں کی نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی فسطائیت، جنگ اور ظلم سے نفرت ہے...اور گو میں سیاستدان نہیں

ہوں، لیکن مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُداس نغمے سے اُداسی ہی پیدا ہوتی ہے، جو نغمہ خود اُداس ہے وہ دوسروں کو بھی اداس کر دیتا ہے۔ جو آدمی خود غلام ہے، دوسروں کو بھی غلام بنا دیتا ہے۔ دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے، یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ آدمی کرب کی اُس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں جو ان کی روحوں کو چیر کر نکل رہی ہے اور ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی سے ملا دیتی ہے۔ جب تلک میری ستار کا ایک تار بھی بے آہنگ ہوتا ہے اس وقت تک سارا نغمہ بے آہنگ و بے ربط رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں یہی حال انسانی سماج کا بھی ہے۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے یہ دنیا بھوکی رہے گی، جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی غلام ہے سب غلام رہیں گے۔ جب تک دنیا ایک آدمی بھی مفلس ہے سب مفلس رہیں گے....!

اسی لیے میں تم سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں۔

تم مجھے مردہ نہ سمجھو۔ مردہ تم ہو۔ میں زندہ ہوں اور اپنی پھٹی پھٹی بے نور بے بصر آنکھوں سے ہمیشہ تم سے یہی سوال کیا کروں گا۔ تمھاری راتوں کی نیند حرام کر دوں گا۔ تمہارا اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا سب دوبھر ہو جائے گا۔ تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا میں اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک تم میرے سوال کا تسلی بخش جواب نہ دو گے۔

میں یہ سوال اس لیے نہیں پوچھ رہا ہوں کہ میں تمہاری نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔

میں یہ سوال اس لیے بھی پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں نے جل پری کو بے گور و کفن سڑک پر چھوڑ دیا ہے اور میرے ہاتھ میں لکڑی کا ایک جھنجھنا ہے....!

دس روپے کا نوٹ

کرشن چندر

میں آٹھ نومبر 1946 میں ناک شہر میں پیدا ہوا۔ لیکن مجھے وہاں رہنے کا بہت کم موقع ملا ہے میں

ایک آوارہ گرد سیلانی ہوں۔ گاؤں شہر شہر گھومتا ہوں اور سدا چکر میں رہتا ہوں۔

جہاں جاتا ہوں لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور مسکراتے ہوئے چہروں سے میرا استقبال کرتے ہیں۔ اس دنیا میں میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ سب میرے دوست ہیں، سب مجھے دل سے چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ سیکھا ہے۔ کھویا ہے، لیکن اپنی زندگی کے ان گنت تجربوں کے باوجود ایک بات میں بے کھٹکے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی چھوٹی سی زندگی میں میں نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ آج تک کسی بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر یا فلم اسٹار کو بھی وہ شہرت اور مقبولیت نہیں ملی جو مجھے مل چکی ہے۔ بچہ بچہ مجھے جانتا، پہچانتا ہے اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔

میں دس روپے کا نوٹ ہوں۔

کئی ماہ تک میں مشہور سٹار شہزادی کے ڈرائنگ روم میں لکڑ بابا کی تصویر کے فریم کے گرد نوٹوں کے ہار میں لٹکا رہا۔ شہزادی لکڑ بابا کو بہت مانتی تھی اور اس نے دس دس کے نوٹوں کو لے کر پانچ سو روپے کا ہار لکڑ بابا کی تصویر کے گرد لٹکا دیا تھا۔ شہزادی کا سب سے چھوٹا بھائی (جو دراصل اس کا بھائی نہیں تھا بیٹا تھا) گھر کا لاڈلا تھا۔ گھر کے لوگ اسے پیار سے منا کہتے تھے۔

یوں تو منا کو اس کی ماں اور شہزادی دونوں پاکٹ منی دیتے تھے۔ مگر منّا لاڈلے بچوں کی طرح بہت شاہ خرچ تھا اور اب اس نے اپنی ماں بہن کے علاوہ لکڑ بابا سے بھی روپیہ نکالنے کا طریقہ ایجاد کر لیا تھا۔ وہ بہت ذہین بچہ تھا اور جب اس کی فضول خرچی کو روکنے کے لیے یا اسے سزا دینے کے لئے امی اور شہزادی اس کی پاکٹ منی روک دیتے۔ یا پاکٹ منی جلد ختم ہو جاتی اور منّا کو مزید رقم کی ضرورت پڑتی تو وہ سب کی نظر بچا کر ایک کرسی پر اسٹول رکھ کر کسی نہ کسی طرح لکڑ بابا کی تصویر تک پہنچ جاتا اور ہاتھ جوڑ کر کہتا۔

''لکڑ بابا بھیل پوری کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ اگر بُرا نہ مانو تو تمہارے ہار میں سے ایک روپیہ لے لوں۔''؟

''لے لوں!''

''بس ایک روپیہ لوں گا۔ صرف ایک اور پھر کبھی نہیں لوں۔''

اس پر منا کو ایسے محسوس ہوتا جیسے لکڑ بابا تصویر میں جھانک کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور اسے ہار میں سے ایک روپیہ نکالنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس پر منا خوش ہو کر لکڑ بابا کی تصویر کو چوم لیتا اور ہار میں سے ایک روپیہ کا نوٹ نکال کر چلا جاتا۔

مدتوں یہی عمل جاری رہا کبھی بھیل پوری کے لئے کبھی مصالحے کی چاٹ کے لیے کبھی آئس کریم کے لیے کبھی غباروں کے لیے، کھلونوں کے لیے۔ دوستوں کو قرض دینے کے لیے.....ایک روپے کے نوٹ ہار میں نکلتے رہے۔

شروع شروع میں تو پتہ نہیں چلا۔ پھر ہولے ہولے ہار خالی ہونا شروع ہوا۔ بیچ بیچ میں سے گنجا ہونے لگا۔ ایسا لگا جیسے پت جھڑا کا موسم ہار پر آ چلا ہے۔ ایک دن منّا صاحب عین اس عالم میں پکڑے گئے۔ وہ جب کرسی پر تپائی رکھ کر نوٹوں کے ہار میں سے مجھے نکال رہے تھے۔ شہزادی کو اس سے پہلے تو گھر کے نوکروں پر شبہ تھا۔ لیکن ایک نوکر شہزادی کو جلدی سے بلا کر لایا اور انہیں منّا صاحب کو دکھایا تو شہزادی نے منّا کو کرسی سے نیچے گھسیٹ کر دو ہاتھ لگائے۔ نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر اپنے پرس میں ڈال لیا.....بلکہ سارا ہار ہی نوچ کر اس نے اپنے پرس میں ڈال لیا۔

اس پر منّا شہزادی کی گود میں لیٹا لیٹا ٹانگیں ہلا ہلا کر مچلنے لگا زور زور سے چیخنے چلانے لگا تو شہزادی نے اسے اور مارا۔ اور مارا۔ اتنا مارا کہ امی دوڑتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں گھس آئیں اور بچے کو اس کی گود سے چھین کر غضب ناک آواز میں بولیں۔

''ارے.....ارے.....ارے.....یہ کیا کرتی ہو؟ اپنی ہی کوکھ کے جائے پر اتنا ظلم ڈھاتی ہو۔ صرف دس روپوں کے لیے؟ اپنے ہی بچے پر؟ تمہیں شرم نہیں آتی!''

کہنے کو تو امی جان نے غصّے میں اتنا کہہ دیا۔ مگر کہتے کہتے انہوں نے اپنی غلطی کو محسوس کر کے دانتوں کے تلے انگلی داب لی۔ شہزادی نے بھی منہ پر انگلی رکھ کر جلدی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اتفاق سے اس وقت ڈرائنگ روم میں ماں بیٹی اور بچے کے علاوہ اور کوئی موجود نہ تھا۔

شہزادی کی جان میں جان آئی۔ ماں شرمندہ ہو کے چپ تھیں۔ منّا ان کی چھاتی میں دبکا ہوا منہ چھپائے ہوئے تھا۔ سارے کمرے میں سناٹا تھا۔

یکا یک منّا نے سر اٹھا کے شہزادی کی طرف دیکھا اور سسکتے سسکتے کہا۔

''ہم کو دس روپے دے دو! نہیں تو ہم سب سے کہہ دیں گے۔ ہم امی کے بیٹے نہیں ہیں، ہم شہزادی کے بیٹے ہیں۔''

اپنی ماں سے دس روپے لے کر منّا اپنی نئی طاقت کے احساس میں سرشار اپنی نانی کی گود سے اترا اور باہر بازار میں آئس کریم کھانے چلا گیا۔ اگر میں اس کی زندگی کا پہلا بلیک میل تھا تو کیا ہوا۔ ابھی تو اس کی عمر صرف سات سال ہے۔

آئس کریم اینڈ ملک بار کے کاؤنٹر سے میں فیروز اور خانم کے ساتھ کر لیا گیا۔ جو ملک بار سے آئس کریم کھا کر نکل رہے تھے۔ دوکان سے باہر نکل کے خانم کو یاد آیا۔ کہ ان کے علاقے میں بنا سپتی گھی بھی بلیک میں چلا گا ہے۔ اس لیے انہوں نے قریب کے بنیئے کی دوکان سے بنا سپتی گھی کا ایک ڈبہ خریدا بنئے کی دوکان سے مجھے مسز ایڈل جی کے ہمراہ کر دیا گیا۔ جس نے بنئے سے بہت سامان خریدا تھا۔ مسز ایڈل جی نے مجھے ایک بساطی کے حوالے کر دیا جس کی دوکان سے انہوں نے اپنے ڈرائنگ روم کے لئے نئے پردوں کا کپڑا خریدا تھا۔ اسی بساطی کی دوکان پر ابھی منظور کلرک اپنی، بیوی بطول کے ہمراہ سیلز اکاونٹر پر کھڑا اپنے گھر میں ہونے والی پہلی خوشی کے سلسلے میں کچھ ضروری کپڑے خرید رہا تھا۔ بچے کے پوتڑوں، فراکوں اونھی ننھی رنگ دار ٹوپیوں کے لیے کپڑے۔ ان کے ساتھ میں شربت والے کی دوکان پر آیا۔ کیوں بطول کو پیاس لگ رہی تھی۔ شربت والے نے مجھے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کے سپرد کیا۔ جس نے اس کی دوکان سے یکے بعد دیگرے شربت کے چار گلاس پیئے تھے۔ اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے دوکان سے باہر نکل کر قریب کے دوا فروش سے سردرد کی گولیوں کا ایک پورا ڈبہ خریدا اس ادھیڑ عمر کے آدمی کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ صرف اسے سدا سردرد رہتا ہے۔ بلکہ خود اس کی ذات دنیا کے لیے مستقل سردرد ہے۔ سردرد کی گولیاں خرید کے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور اپنی منزل پر پہنچ کر اس نے مجھے ٹیکسی والے کے حوالے کیا۔ ٹیکسی والے نے پٹرول پمپ سے پٹرول ڈالا مجھے پٹرول پمپ والے کو دیا۔ پمپ والے نے ایک ایسے جوڑے کو دیا جنہوں نے پہلی بار موٹر خریدی تھی۔ اور اس میں بیٹھ کر سنیما جا رہے تھے۔ سنیما دیکھ کر میں ان کے ساتھ لوٹ رہا تھا کہ پھر ایک پٹرول پمپ پر پہنچا دیا گیا۔ جہاں سے میں غلام علی موٹر مکینک کی جیب پہنچا۔ غلام علی مجھے لے کر بازرے کے شبدڈ حمام والے کے یہاں چلا گیا۔ حمام والے نے مجھے ایک حجام کے سپرد کیا۔ حجام نے کبابیئے کے سپرد کیا۔ کبابیئے نے کرائے میں مجھے کافِ دلپسند کے مالک کے حوالے کیا۔ جس کی دکان کے باہر ایک کونے میں وہ کباب کی دکان لگاتا تھا۔ کافِ دلپسند کے یہاں سے میں ماسٹر برگانزا ٹیلر کی جیب میں آیا جس نے دوسرے دن مجھے سیٹھ منگھا رام کے حوالے۔ جس نے ماسٹر برگانزا کی دکان سے ایک سوٹ سلوایا تھا۔ سیٹھ منگھا رام کی کلب میں ایک بہت بڑی کیوریوشاپ تھی۔ وہاں جہاں بڑے بڑے امیر لوگ اور غیر ملکی سیاح اور خریدنے آتے ہیں۔ منگھا رام ایسی ایسی نادر چیزیں اپنی دکان میں جمع کر کے رکھتا ہے۔ ہانگ کانگ سے لے کر نیویارک تک اس کے مال کی کھپت تھی۔ شہر کے باہر کئی علاقوں میں اس نے چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں قائم کر رکھی تھی۔ جہاں نہایت رازداری سے پرانا مال تیار ہوتا تھا۔ ایک فیکٹری میں ساتویں صدی کے بدھ کے

بُت بنائے جاتے تھے۔ایک فیکٹری دوصدی قبل از مسیح شیو جی کے بت بنانے کے لئے وقف تھی۔ایک فیکٹری میں صرف وہ سامان تیار ہوتا تھا جو موہن جو دارد اور ہڑپہ کی کھدایوں سے نکلا ہے ایک فیکٹری صرف مغل عہد کے نوادرات مینوفیکچر کرتی تھی۔نور جہاں کا عطر دان، بابر کی تلوار، جہانگیر کا خنجر۔جودھا بائی کی پوجا کی تھالی۔اکبر کی انگوٹھی۔اورنگ زیب کا اگال دان اور ممتاز محل کا پاندان۔سب کچھ سیٹھ منگھا رام کے یہاں ملتا تھا۔ایک فیکٹری..... پرانی کھائی ہوئی مکڑی کے تایخی سامان تیار کرتی تھی۔یعنی اشوک کی خواب گاہ کا دروازہ چندر گپت کے پلنگ کا پایہ۔مہارانی پدمی کے آئینے کا چوبی فریم.کالی داس کی چھڑی۔ گرودشوامّہ کی کھڑاویں۔ایک دفعہ کومنگھا رام کا ایک سیلز مین ایک یورپی سیاح کو جانکیہ رشی کی عینک تک بیچ دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

بارہ سوروپےاور سیٹھ منگھا رام نے اپنے ملازم کی کارگردگی پر خوش ہوکر سوروپےانعام دیا تھا۔

کل رات سیٹھ نے دکان کے گلّے میں سے کچھ رقم ادھار لی تھی۔حساب پورا کرنے کے لیئے اس نے اپنا بٹوہ کھولا اور رقم برابر کر کے اس کے مجھے بھی نوٹوں میں ڈال کر کل رقم ایک ملازم کے حوالے کر کے کہا کہ وہ اسے کل کے حساب میں جمع کر کے بینک میں رقم ڈال آئے۔سیٹھ کے ملازم نے رقم لے کر احتیاط سے سب نوٹوں کو گنا۔مجھے دیکھ ٹھٹھک گیا۔کیونکہ متواتر استعمال سے اور پانچ سال ایک گندی ہانڈی میں رہ کر میں اتنا کثیف میلا اور خستہ ہو چکا تھا کہ ہر ایک کی نگاہوں میں چبھنے لگتا تھا۔

ملازم نے مجھے غور سے دیکھا وہی ملازم تھا جو گردچانکیہ کی عینک بیچ چکا تھا۔دیکھنے میں اب میں اس قدر پرانا ہو چکا تھا کہ اگر مجھ پر یہ انگریزی حروف چھپے ہوئے نہ ہوتے تو وہی ملازم مجھے محمد تعلق کے زمانے کا نوٹ سمجھ کر بیچنے پر تیار ہو جاتا۔اس پر بھی وہ مجھے دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کر پر لگے ہیں جس کی وجہ سے وہ مجھے اس قدر غور سے دیکھ رہا تھا دن کا نوٹ ہی تو ہوں۔

بالآخر وہ ملازم سیٹھ کے پاس پہنچا۔سیٹھ کے سامنے میز پر رکھ کر بولا۔

''ذرا اس نوٹ کو غور سے دیکھئے۔''

سیٹھ نے مجھ پر سرسری سے ایک نگاہ ڈال کر کہا۔

''کیا دیکھوں؟ دس کا نوٹ ہی ہے۔کیا تمہیں سوکا دکھائی دیتا ہے''؟

سیٹھ نے ملازم پر ایک طنز آمیز نگاہ ڈال کے کہا۔

''ذرا غور سے دیکھیئے !ملازم نے پھر اصرار کیا۔''انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے۔''

سیٹھ نے چونک کر دیکھا ۔ واقعی میرے ماتھے پر جہاں RESERVE BANK OF INDIA لکھا تھا۔ وہاں انڈیا کا لفظ یوں لکھا تھا.....INdIA

''ارے واقعی D کی جگہ d ہے یعنی الٹی ڈی۔''

اور ملازم نے مجھے بالکل سیٹھ کی آنکھوں کے نیچے سرکاتے ہوئے کہا۔ یہ دیکھئے جہاں لکھا ہے I PROMISE TO PAY THE BEARER ON DEMAND اوہاں لفظ__ PROMISE کی E(ای) غائب ہے۔''

''واقعی!'' سیٹھ نے غور سے مجھے پرکھتے ہوئے کہا۔ ''واقعی!'' یہ تو....یہ تو ایک نایاب نوٹ ہے۔''

سیٹھ منگھا رام کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی ڈی الٹی ہے اور ای بالکل غائب ہے۔''

یکا یک سیٹھ کے دل میں خیال گزرا۔ اس نے ملازم کے منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہیں جعلی تو نہیں ہے۔''!

ملازم چپ رہا۔

کچھ سوچ کر سیٹھ بولا۔ ''تم اس نوٹ کو یہیں چھوڑ کر جاؤ۔ میں سب معلوم کرتا ہوں۔''

میری جگہ اس نے ملازم کردس کا دوسرا نوٹ دے بینک بھیج دیا۔ وہ خود کرنسی آفس میں فون کر کے مجھے اپنی جیب میں ڈال چلا گیا۔ پانچ چھ دن میں سیٹھ منگھا رام کے پاس رہا۔ وہ روز مجھے بڑی احتیاط سے اپنی سیف میں بند کر دیتا تھا۔ سب پوچھ پاچھ کرنے کے بعد جب سیٹھ نے اپنا اطمینان کر لیا تو اس نے میرے لیے چاندی کا فریم بنوایا۔ اور اس میں مجھے جڑوا کر اس ملازم سے کہنے لگا۔

''میں نے سب معلوم کر لیا ہے۔ یہ نوٹ بالکل اصلی ہے۔ ناسک سے شائع ہوا تھا۔ مگر ڈائی غلط ہوگئی اور غلط چھپ گیا۔ اپنی طرز کا واحد نوٹ ہے یہ ہندوستان بھر میں بالکل نایاب ہے۔ میں اخباروں میں اس اشتہار دیتا ہوں۔ اور اگلے ماہ کے نیلام میں اس کی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا اور جو بھی قیمت حاصل ہوگی اس کا پانچ فیصدی تمہیں دوں گا۔ کیونکہ سب سے پہلے تم نے اس نوٹ کی نایاب خوبی کو پہچانا ہے۔''

ملازم نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ اتنے میں سیٹھ کی نئی سٹینو چند کاغذات ٹائپ کر کے حاضر ہوئی۔

سیٹھ منگھا رام پہلا خط پڑھتے ہی غصّے سے بھڑک گیا۔ ''ہیجے کی اتنی غلطیاں؟ OF'' COURSE WE PROMISED TO PAY" اسی طرح لکھا جاتا ہے؟ PROMISED کا ''ای'' غائب ہے اور ڈالر کا ''اے''.....A کدھر گیا؟ کیا گھر سے ناشتہ کر کے

نہیں آتی ہو؟ جو یہاں لفظوں کے حروف کھانے شروع کر دیتی ہو ہماری فرم نیویارک تک بزنس کرتی ہے۔ایسی غلطیاں بچّے کی یہاں نہیں چلیں گی۔اکاوٹنٹ سے اپنا حساب چکتا کرواور جاؤ____!''

سیٹھ نے کانپتی ہوئی نئی اسٹینو کے ہاتھ میں ٹائپ شدہ خط دستخط کیے بغیر واپس کرتے ہوئے کہا۔

اس دن نیلام میں بڑی بھیڑ تھی۔جس دن میری بولی لگائی گئی۔دور دور سے نادر اشیا،خریدنے والے تھے اور بڑی حیرت،کسی قدر شبہ اور شوق سے مجھے دیکھ رہے تھے۔مگر سیٹھ منگھا رام نے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔دمکتے ہوئے چاندی کے فریم کے نیچے ناسک پرنٹری کا ایک سرکاری کاغذ ہوا میں ہولے ہولے ہل رہا تھا۔جس پر صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ میں کوئی جعلی نوٹ نہیں ہوں۔اصلی نوٹ ہوں۔میری تاریخ اشاعت بھی درج تھی۔شبہے کا کوئی بھی امکان نہ تھا۔

بولی شروع ہوئی۔

سیٹھ منگھا رام نے چلاّ کے کہا۔''دس کے نوٹ کی قیمت ایک ہزار روپے۔''

''دو ہزار روپے۔''

''تین ہزار روپے۔''

''تین ہزار پانسو۔''

''تین ہزار سات سو۔''

''تین ہزار سات سو تین ہزار سات سو۔''

''سارھے چار ہزار۔''

''پانچ ہزار۔''

میرا سر چکرانے لگا۔کیسی عجیب وغریب دنیا ہے۔کل تک میں محض دس کا نوٹ تھا۔آج میری قیمت پانچ ہزار روپے ہے۔

مجھے وہ ہزاروں آنکھیں یاد آ گئیں جنہوں نے اب تک مجھے دیکھا تھا اور میرے ماتھے پر لکھے ہوئے لفظوں پر بھروسہ کیا تھا۔

I PROMISE TO PAY THE BEARER ON BEMAND THE SUM OF RUPEES TEN AT ANY OFFICE OF ISSUE.

''چھ ہزار روپے۔''

''سات ہزار روپے۔''

''سات ہزار آٹھ سو۔''

''سات ہزار آٹھ سو۔سات ہزار آٹھ سو.....ایک!

''آٹھ ہزار۔نو ہزار۔دس ہزار۔''

دس ہزار؟ میں حیرت سے چونک پڑا۔کیا میری قیمت واقعی دس ہزار ہے؟ کل تک میں دس روپے کا نوٹ تھا۔آج میری قیمت دس ہزار کیسے ہوگئی؟ وہی میں ہوں۔وہی کاغذ ہے۔وہی ٹھپہ ہے۔

''بارہ ہزار۔''

''بارہ ہزار.....؟ بارہ ہزاہ میں ایک لڑکی کی شادی ہوسکتی ہے مگر بولی بڑھتی جارہی ہے۔

''تیرہ ہزار۔''

''تیرہ ہزار چھ سو۔''

''تیرہ ہزار نو سو۔''

''چودہ ہزار۔''

''اٹھارہ ہزار!'' __ایک دبلا پتلا نوجوان کانچ کے بڑے بڑے محدب شیشوں والی عینک چڑھائے ہوئے بول اٹھا۔

''اٹھاہ ہزار؟.....میں نے اس زرد رتقریباً کرم خردہ نوجوان کی بوسیدہ صحت والے جسم کی طرف دیکھا۔اب میری قیمت اٹھارہ ہزار ہے۔کل تک وناسپتی کا ایک ڈبہ بھی نہیں خرید سکتا تھا۔آج ایک موٹر خرید سکتا ہوں.....اٹھارہ ہزار.....؟

''اٹھارہ ہزار....اٹھارہ ہزار.....سیٹھ منگھا رام اس زرد رنوجوان کی دیکھ کر چلّایا۔وہ اسے پہچانتا تھا۔وہ زرد رونو جوان ملک کے مشہور کروڑ پتی سیٹھ چمن لال کا بیٹا مگن لال تھا۔مگن لال کو نوادرات جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔اس نے اپنے عالیشان گھر میں ایک عجائب خانہ بنا رکھا تھا۔جس میں دنیا بھر کے کیور یولا کے جمع کرتا تھا۔محدّب شیشوں کے پیچھے اس کی منحنی سی آنکھیں گہرے تجسس شوق اور اضطراب سے چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔وہ نوادرت کا دیوانہ تھا۔

اب سب لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے۔مگن لال کا مقابلہ ایک امریکی سیاح سے تھا۔چارلس ڈولٹل نیویارک میں سالسڑ تھا۔ایک کامیاب وکیل۔

دنیا کے امیر ترین ملک کا شہری ___ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔

بیس 20 ہزار!

''بائیس 22 ہزار!'' مگن لال بولا

''پچیس 25 ہزار!!'' دولٹل نے ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑی لاپرواہی سے کہا۔

''ستائیس 27 ہزار!'' مگن لال اپنی باریک آواز میں اتنے زور سے چلّایا کہ مجمع میں ایک کے چہرے پر مسکراہٹ جھلک اٹھی۔

''تیس 30 ہزار!!'' ڈولٹل ٹھنڈی بھاری آواز میں بولا۔

''تیس 30 ہزار!!'' میرے ہوش وحواس جواب دینے لگے آخر میں نے کیا کیا تھا؟ کون سا ایسا تیر مارا تھا؟ کون سی ایسی کڑی محنت کی تھی! کس کی بھلائی کے لیے دن رات ایک کر دیا تھا؟ جس کے انعام میں میری قیمت اس قدر بڑھادی گئی تھی۔ مگر یہ تو ایک عجیب وغریب نامعقول ٹیڑھا سماج ہے۔ یہاں پر فوجی خامی ہے۔ یہاں اگر آپ سیدھے سچے اور کھرے ہیں، تو آپ کی قیمت دس کے نوٹ سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر آپ کی ڈی الٹی ہے اور ای غائب ہے تو آپ کی قیمت تیس ہزار بھی سکتی ہے۔ نوٹ کے ہجے غلط ہوں تو وہ سب سے قیمتی ہے۔ آدمی کے ہجے غلط ہوں تو وہ دفتر سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ سیٹھ منگھا رام کے اسٹینوں کی طرح..... ''بتیس ہزار!'' مگن لال غصّے سے چلّایا۔

چارلس ڈولٹل مسکرایا۔ اس کا مقابلہ ایک دیوانے سے تھا۔ یکا یک اس نیلام سے اس کی ساری دلچسپی غائب ہوگئی اور وہ پلٹ کر شو کے کسی پُرانے بُت کو دیکھنے لگا۔ چند منٹ تک سیٹھ منگھا رام سے متوجہ کرے کے لیے چلّاتا رہا اور میری خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا رہا۔ مگر اس امریکی سیاح کا دل مطلق نہ پسیجا آخر اس نے مجھے بتیس ہزار روپوں کے عوض مگن لال کے حوالے کر دیا۔

چونی لال کی کلکتے میں دو جوٹ کی ملیں تھیں۔ ایک ٹیکسٹائل ملِ احمد آباد میں تھی۔ ایک بمبئی میں کھانڈ بنانے کا کارخانہ یوپی میں۔ کانپور میں لوہے کی ایک بہت بڑی فونڈری۔ اور اب وہ گوالیار میں ریان کا ایک بہت بڑا کارخانہ کھولنے میں مصروف تھا۔ اسے ایک نئی بات کا غم تھا۔ اس کے بیٹے کے کوئی اولاد نہ ہوتی تھی مگن لال ابھی تک لاولد تھا۔ اور مگن لال چونی لال کا اکلوتا بیٹا تھا۔

مگن لال اولاد پیدا کرنے کے لیے تقریباً ناقابل تھا۔ تقریباً اس کے سارے جذبات مرد کے سے تھے۔ وہ عشق کی آگ اور اس کی حدّت کو ایک مرد کی طرح محسوس کرتا تھا۔ مگر اس کا جسم کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ وہ محسوس کرتا کہ تخلیق کا ایک شعلہ سا اس کی روح میں لپک رہا ہے مگر اس کی روح اور اس کے شدید احساسات کے گرد جسم ایک ٹھنڈے، سن اور برفیلے غول کی طرح اس کے گرد لپٹا ہوا ہے اور یہ برف جو کسی

طرح پگھلتی نہیں ہے اس کے بھڑ کتے ہوئے خوبصورت جذبات کا ناکام بنا دیتی اور وہ ایک زخم کھاتے ہوئے جانور کی طرح اپنی روح کے شدید احساسات اور اپنے جسم کے پر ہول سناٹے کی آویزش سے چیخ اٹھتا۔ ٹھنڈے جسم کے ساتھ اگر روح بھی ٹھنڈی ہو تو کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن فطرت نے اسے ایک شعلہ بجان روح دے کر اور اس کے گرد برف کا ایک دائرہ کھینچ کر اس سے شدید بے انصافی کی تھی۔ کیونکہ مگن لال کی حسن پرستی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر اس کا ذہنی ردعمل وہی ہوتا تھا جو کسی مکمل مرد کا ہوتا ہے۔ وہ اس کے جسم کے خطرناک خم، اس کی نگاہ کی آتش نوائی اور اس کے ہونٹوں کی بولتی ہوئی دعوت سے اسی قدر متاثر ہوتا تھا جس قدر کوئی بھی صحت مند اور تندرست مرد متاثر ہو سکتا ہے ___ اپنے افتاں وخیزاں جذبات کے سہارے ڈولتا ہوا جب وہ کسی عورت کے قریب چلا جاتا اور اسے چھونے کی کوشش کرتا تو نہ صرف اس عورت کو بلکہ خود اسے بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ کسی مرد کی انگلیاں نہیں ہیں جو کسی عورت کو چھو رہی ہیں۔ برف کی قلمیں ہیں جن کے لمس سے عورت کے بدن میں بیزاری اور نفرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور وہ کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ دیواروں کی ٹکریں مارتا دو دفعہ اس نے خود کشی بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ناکام رہا۔

پے در پے ناکامیوں کے بعد اس نے اپنی روح کی شعلہ سامانی کو تحلیل کرنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اس نے شدید جنسی حس کو ایک شدید جمالیاتی حس میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ عورت کا جسم اس کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر خوبصورت تصویریں تو اس کی ہو سکتی تھی اور سنگِ مرمر کے پُرانے بُت جن پر وینسی کا شبہ ہوتا تھا۔ کانسی کے نٹ راج کا منمد خرام.....اور وہ شمع دان جو مغلوں کے حرم میں حسن وعشق کی لو کو تیز کرتے تھے۔ ان اشیا اور کیوریوز پر وہ دائمی قبضہ کر سکتا تھا اور ان اشیا کا حسن ایسا تھا جو اس کی ٹھنڈی انگلیوں کے لمس سے بیزار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک کروڑ پتی باپ کا بیٹا تھا اور اس کی جائیداد کا واحد وارث تھا۔ اب وہ اگر خوبصورت عورتوں کا حرم نہیں سجا سکتا تھا تو خوبصورت چیزوں کا ایک عجائب خانہ کھول سکتا تھا اور یہی اس نے کیا۔ اس نے اپنے محل نما گھر ایک وسیع حصّہ ان حسین وجمیل نوادر کو رکھنے کے لیے وقف کر دیا۔ جو وہ دنیا کے مختلف حصوں سے خرید کر جمع کرتا تھا۔ ہولے ہولے اس کا یہ شوق بڑھتا گیا اور اب وہ ان نوادر کے خریدنے نے، رکھنے سنبھالنے اور دوسروں کو دکھانے میں ایک لذت معکوس سی محسوس کرنے لگا۔ اب بھی اس کی بیکراں روح کا کرب اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر اب گاہے گاہے اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے زخم پر پھایا رکھ دیا ہوا۔

مگر اس کا باپ ایک عملی آدمی تھا۔ اتنا اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ یہ کہ اس کے بیٹے کے مرنے کے بعد اس کی کروڑوں کی جائیداد دوسرے لوگوں میں بٹ جائے گی۔ اس کا خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ٹھیک کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کئے۔ طرح طرح کے علاج کئے۔ چار بار اسے یورپ لے گیا جدید سے جدید طریقے آزماتے ہوئے اس نے لاکھوں پھونک ڈالے انہیں میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مگن لال کی شادی کسی حسین لڑکی سے کردی جائے مگن لال کے بار بار منع کرنے پر چونی لال نے اپنے بیٹے کی شادی ایک غریب گھرانے کی مگر انتہائی خوبصورت لڑکی سے کردی۔

رسنا اس کا نام تھا۔ شباب کا رس اس کی رگوں میں دوڑتا نہیں تھا، کھولتا تھا، وہ ایک تند و تیز لاوے کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں بپھرے ہوئے سمندر کی لہروں کا خرام تھا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کا گوندا تھا۔ اور انگلیوں میں آگ کی لپٹ مگن لال اسے دیکھ کر دیوانہ ہوگیا۔ یکا یک ایسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ رسنا کو اپنی بانہوں میں لے کر مکمل مرد بن جائے گا۔

پھر وہ بجھ سا گیا۔ رسنا چند ماہ تو اپنے کھولتے ہوئے جذبات میں کسمائی رہی ٹوٹتی رہی، اور ٹوٹ کر بنتی رہی پھر یکا یک وہ پاگل ہوگئی۔ دو سال تک وہ پاگل رہی۔ پھر جب اچھی ہوئی تو وہ بھی بجھ سی گئی۔ اس کے سسر نے اس محل نما گھر میں اپنی بہو کے لئے ایک مندر بنوادیا تھا۔ جہاں وہ اکثر اکیلے میں پوجا کر کے اپنا دل بہلایا کرتی تھی اس کی آواز میں ایک عجیب کرب آمز سنگیت کا رس اتر آیا تھا۔ گھنٹوں وہ رادھا کرشن کی مورتیوں کے سامنے بیٹھی اپنے چھوٹے سے مندر میں بھجن گایا کرتی اور بھجن گاتے گاتے ایک عجیب محویت کا عالم میں بے ہوش ہوجایا کرتی وہ ایک غریب گھر کی لڑکی تھی مگر اسے یہاں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ دو گورنسیں اسے بہترین تعلیم اور مغربی آداب سکھانے پر مامور کی گئی تھیں۔ نوکروں کا ایک لمبا چوڑا عملہ تھا جو دن رات اس کی ہر خواہش کو چٹکیوں میں پورا کرنے کے سے کوشاں رہتا تھا۔ اس پر بھی کئی بار رسنا کا دل یہاں سے بھاگ جانے کو چاہا۔ مگر سونے کی زنجیریں بہت خوبصورت تھیں۔

رسنا کو شدید طور پر چاہنے کے باوجود اب مگن لال نے اس سے الگ رہنا سیکھ لیا تھا۔ کیونکہ ساتھ رہنے میں شدید کوفت ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے جسم و جان کے ریشے ریشے ٹوٹ جائیں گے۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اپنے کیورلوز کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ اس کا ملنا جلنا اس قدر بڑھ چکا تھا کہ اکثر اوقات اکیلے میں وہ ان سے گفتگو تک کرنے لگتا اور اسے محسوس ہوتا کہ تصویریں بھی بولتی ہیں۔ اور سنگ مرمر کے یونانی صنم اس سے باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اب وہ محل کے اس حصے میں بہت کم جاتا تھا جہاں رسنا رہتی تھی۔ صرف دوپہر کے کھانے پر وہ ملتے تھے اور رات کے کھانے پر اور یہ دونوں اوقات بھی

اس کے لیے سوہان روح بن جاتے تھے۔ مگر وہ مجبور تھا۔ پتا جی کا حکم تھا اور پھر نوکروں کے سامنے دنیاداری برتنا بھی ضروری ہے۔

جس دن مگن لال نے مجھے خریدا وہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر اس قدر خوش ہوا کہ یہ خوش خبری رسنا کو سنائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح اپنے ہاتھوں میں تھامے رسنا کے بیڈروم میں چلا گیا۔ جو اَب دوپہر کی نیند لے کر سنگھار میز کے سامنے اپنے کھلے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی بل کھاتے ہوئے آراستہ بال جو کمر تک جاتے تھے۔ کنگھی اور رسنا کے بالوں کے ملے جلے لمس سے لہراتی ہو کی ناگنوں کی طرح بیدار ہو رہے تھے۔

رسنا اسے یوں غیر متوقع طور پر اپنے بیڈروم میں آتے دیکھ کر چونک پڑی مگن لال بے حد خوش خوش اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''دیکھو! میں نے کیا خریدا ہے۔''؟ وہ بچوں کی طرح چلاّ پڑا۔

رسنا نے مجھے دیکھ کر کہا۔'' یہ تو دس روپے کا ایک نوٹ ہے۔''

''ہاں ہے تو دس روپے کا مگر میں نے اسے تیس ہزار میں خریدا ہے۔''

''ایسے باؤلے پن کی باتیں تم اکثر کرتے رہتے ہو۔''

''یہ باولا پن نہیں ہے۔ یہ کوئی معمولی عام دس روپے کا بازاری نوٹ نہیں ہے۔ یہ ایک خاص نوٹ ہے۔ نایاب نوٹ ہے۔ اس نوٹ کا ثانی سارے ہندوستان میں نہیں ہے۔ بلکہ شاید ساری دنیا میں نہیں ہے۔ آج دوپہر میں مَیں نے نیویارک میں ایک ڈیلر کو ٹیلیفون کیا تھا۔ وہ اس نوٹ کے عوض ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہے۔''

آخر اس نوٹ میں ہے کیا۔''؟ رسنا بڑی بیزاری سے میرے چاندی کے فریم کو دیکھنے لگی اور کانچ پر ہاتھ پھیر کر اور مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر اوپر اٹھا کے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ استفہامیہ نگاہ سے۔''ذرا غور سے دیکھو! انڈیا کی ڈی الٹی چھپ گئی ہے اور اوپر اس کی ای غائب ہے۔'' مگن لال نے اسے بتایا۔

اب رسنا نے غور سے مجھے دیکھا۔ پھر خاموشی سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اگر اس نوٹ کی ڈی الٹی ہے اور ای غائب ہے تو کیا ہوا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں تمہارے جسم کی ای بھی تو غائب ہے اور ڈی الٹی ہے۔ پھر میں کیا کروں؟

''اس دس 10 روپے کو نوٹ کو میں نے تیس ہزار میں خریدا ہے۔ آج ایک لاکھ ڈالر مل رہے ہیں۔

یہ دنیا کا سب سے قیمتی نوٹ ہے۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اس موقع پر میں یہ نوٹ تمہیں تحفے میں دیتا ہوں۔''

رسنا نے مجھے دیکھا۔ سنگھار میز کے لمبے آئینے میں اپنے بالوں کو اپنی کمر کے نازک جسم تک لہراتے دیکھا۔ کمرے کے وسط میں خوبصورت ریشمی چادروں سے سجے ڈبل بیڈ کی طرف دیکھا۔ پھر دلی جلن اور کھولن کی ایک لہر تڑپتی ہوئی اس گلابی گالوں تک آئی اور الاؤ اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا اور اس نے مجھے اور الاؤ اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا اور اس نے مجھے زور سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ چاندی کا فریم تو نہ ٹوٹا لیکن کانچ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

وہ شعلہ باز نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی نفرت کی کاٹ مگن لال کے دل تک اتر گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ضرور بھونچکا ہوا تھا۔ پھر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے چاندی کے فریم کو اٹھا لیا جس میں میں وہ جڑا ہوا تھا اور مجھے لے کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

رسنا نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ ناخنوں سے نوچ نوچ کر اس نے سارے کپڑے پھاڑ ڈالے اور فرش پر ماہی بے آب کی طرح لوٹنے لگی۔ اس کا سارا بدن جل رہا تھا اور ہلکی ہلکی چیخیں اس کے ہونٹوں اس کے ہونٹوں سے نکل رہی تھیں۔ یہ چیخیں جو اس کے اُن چُھوئے بدن کی کراہیں تھیں۔

پھر اس نے سنگھار میز سے یوڈی کلون کی ایک بڑی بوتل اٹھالی جس کے منہ پر ریشمی ڈوریوں میں بندر بڑ کا فوارہ لگا ہوا تھا۔ ربڑ دبا دبا کر وہ یوڈی کلون کی پھوار اپنے منہ پر، اپنی گردن پر، اپنی چھاتیوں پر، اپنے جسم کے مختلف حصوں پر ڈالنے لگی۔ جہاں یوڈی کلون کی پھوار پڑتی جسم ٹھنڈا ہو جاتا تھا۔

ان ہی دنوں میں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم رشر شہر میں وارد ہوا۔ وہ نفسیاتی طریقے سے علاج کرتا تھا۔ پورے یورپ میں اس کے نئے طریقہ علاج کی دھوم تھی۔ وہ یہاں تین ماہ کیلئے آیا تھا۔ چونی لال نے اپنے بیٹے اور بہو کو اسے دکھایا۔ ولیم رشر کے پاس ڈاکٹری کی کوئی رسمی ڈگری نہیں تھی۔ اس کے علاج کا طریقہ بھی انوکھا اوعجیب وغریب تھا۔ مگر کئی پُرانے مریض حیرت انگیز طریقے سے اس ٹھیک کر دیئے تھے۔ وہ صرف بڑے بڑے لکھپتی گھرانوں کا علاج کرتا تھا کیونکہ اس کی پہلی فیس ہی پچاس ہزار روپے تھی۔ ظاہر ہے اتنی بڑی فیس تو کوئی ہما شما ادا کر نہیں سکتا ہے۔

مگن لال اور رسنا کے طبی معائنے کے بعد سیٹھ چونی لال اور ولیم رشر میں دیر تک باتیں ہوئیں.....کیا باتیں ہوئیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا___ مگر بات چیت کے بعد ولیم رشر پھر مگن لال سے ملنے

کے لیے اس کے عجائب گھر میں گیا۔ مگن لال سے اس نے اس کا عجائب گھر دیکھنے کی فرمائش کی۔

دیر تک مگن لال اسے اپنے عجائب گھر کے نوادر دکھاتا رہا۔ کویت کی کھدائیوں سے دستیاب کئے گئے نامعلوم بت گروں کے حسین مجسّمے، زہرہ کے مجسّمے، ایفروڈایتی کے مجسمے احرام مصر سے چرائے ہوئے فراعین کے زمانے کی ممیاں اور ان کے زیورات، مصری کاہنوں کے گلے کے مقدس ہار۔ بھارت نائم ناچتی ہوئی ایک رقاصہ کا بُت۔ کانسی کا اور گیارہوں صدی کی دریافت سسلی کے صوری خنجر اور چاندی کے فریم میں جڑا ہوا چاندی کا ایک نوٹ۔ جس کی قیمت آج ایک لاکھ ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔

مگن لال کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کو ان نوادر کے سلسلے میں زیادہ واقفیت نہ ہوگی۔ مگر لمبے تڑنگے مضبوط اور بے داغ جلد والے مسکراتے ہوئے ڈاکٹر رشر کی معلومات بے حد وسیع اور جامع ثابت ہوئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے آثار قدیمہ کے بارے میں وہ خود کئی سال تک ریسرچ کرتا رہا ہے۔ مگن لال کو اس معلومات پر بڑی حیرت ہوئی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے عجائب گھر میں گھومنے کے بعد مگن لال تھک گیا۔ وہ جلدی تھک جاتا تھا۔ دوسرے موقعوں پر وہ اس کام کے لیے وہ پہیّوں والی ایک کرسی استعمال کرتا۔ مگر آج اس مغربی ڈاکٹر کے سامنے اس نے خود وہیل کرسی پر بیٹھ کر عجائب گھر دکھانا مناسب نہ سمجھا۔

عجائب گھر دیکھ کر وہ دونوں مغربی کونے کے ایک آرام دہ کیبن میں آ گئے۔ جو مضبوط کانچ کا بنا ہوا تھا۔ جس کی ایک دیوار پر میں چاندی کے فریم میں ٹنگا ہوا تھا۔ یہ کیبن مگن لال کا ایک طرح کا دفتر تھا۔ اس کے سوچ بچار کا کمرہ تھا۔ یہیں پر وہ دوپہر میں ایک کونے میں پڑے ہوئے دیوان پر لیٹ کر آرام کر لیتا تھا۔ یہی اس کا گھر تھا۔

اس کیبن میں پہنچ کر مگن لال نے ایک سگریٹ سلگایا۔ ڈاکٹر نے اپنا سگار سلگایا اور چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہوگئی۔

پھر ڈاکٹر بولا۔ ''میرا خیال ہے تمہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔''

''ایں۔'' مگن لال حیرت سے چونک کر تقریباً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو بیٹھو....!'' ولیم رشر نیلی اصلی صاف آنکھوں میں ہمدردی کی ایک جھلک نمودار ہوئی۔

''مگر.....؟'' اتنا کہ مگن لال حیرت سے ولیم رشر کی طرف دیکھنے لگا۔ کیسی وجیہہ کڑی گردن ہے ڈاکٹر کی۔ کسی قدر پر اعتماد چہرہ ہے ڈاکٹر کا۔

''کیا یہ ڈاکٹر جھوٹ بول رہا ہے۔ آج تک دنیا میں کسی ڈاکٹر نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوئی

عارضہ نہیں ہے۔ ہر ڈاکٹر بس اس کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ یہ پہلا ڈاکٹر تھا.....مگر..... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔؟

مگن لال حیرت سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف تکے جارہا تھا۔

ڈاکٹر رشہ نے مسکرا کے کہا۔ (اس کی مسکراہٹ بھی کس قدر صحت منداور دلآویز ہے۔ جیسے خوشی اندر سے جھانک رہی ہو۔ عمر بھی پینتیس چھتیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ مگن لال نے اسے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''سنو مگن! میرا خیال ہے تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ نقص رسنا کے جسم میں ہے۔

''رسنا میں؟'' مگن لال کی آواز یک لخت اونچی ہوگئی۔

''ہاں ہاں! رسنا میں!!! اطمینان سے میری بات سنو۔ میں ٹیکنیکل تفصیلات میں نہیں جاسکتا۔ تم سمجھ نہیں سکو گے۔ موٹے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تمہارا اعصابی نظام بے حد ذکی لمس ہے۔ تمہیں ایسی عورت کی ضرورت نہیں ہے جو لاوے کی طرح بھڑکتی ہو۔ ایسی عورت کا جسمانی ٹمپریچر تمہارے اعصابی نظام کو مشل کر دے گا۔ بدقسمتی سے اس عمر میں جس میں رسنا ہے۔ نوجوان عورتوں کا جسمانی ٹمپریچر بالعموم یہی ہوتا ہے۔ پھر جلد کے اندرونی خلیوں میں جسم کے ہر حصے سے مرد اور عورت کے درمیان الیکٹریکل چارج گزرتے رہتے ہیں۔ وہ مرد اور عورت کے درمیان ایک مخصوص قسم کا جنسی توازن بناتے ہیں۔ اگر وہ الیکٹریکل چارج ایک طرف سے اونچا ہے اور دوسری طرف سے بہت نیچا ہے تو توازن قائم نہیں ہوگا۔ تمہارا احساس اعصابی نظام دوسری طرف سے آنے والے الیکٹریکل چارج کو برداشت نہیں کرتا اور مثبیت منفیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یا نیوٹرل چارج میں بدل جاتی ہے۔

''مگر وہ دوسری عورتیں.....؟'' مگن لال نے فقرہ ناتمام رہنے دیا۔

''بدقسمتی سے تمہیں جو عورتیں بھی ملیں؟..... ہائی وولٹیج والی تھیں۔ ورنہ تمہارے جسم میں کوئی نقص نہیں ہے۔ وہ ایک ذہین اور احساس اعصابی نظام میں کوئی تبدیلی مکمل نمونہ ہے۔ میں تمہارے اعصابی نظام میں کوئی تبدیلی لانا پسند نہیں کروں گا۔ مگر میں رسنا کا علاج کرنا چاہوں گا۔ اس کا جسمانی ٹمپریچر بدلنا چاہوں گا۔ اس کی نفسیات کا مطالعہ کر کے۔ اس کی عادات، خوراک، پوشش میں مناسب تبدیلی کرنا چاہوں گا۔ اس کی جلد کا مطالعہ کر کے اندرونی خلیوں کی بایو کیمک بجلی کی رو کو دھیما کرنا چاہوں گا۔ مگر یہ سب کچھ تمہاری اجازت سے۔ تمہاری تحریری اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔''

مگن لال کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ بڑی مشکل سے بولا۔

''ڈاکٹر کیا تمہیں واقعی یقین ہے کہ مجھے میں کوئی نقص نہیں ہے''؟

''سو فیصدی!''

''اور رسنا تمہارے علاج سے اچھی ہو جائے گی۔''

''اس کی بھی مجھے سو فیصدی امید ہے۔ رسنا ضرور میرے علاج سے اچھی ہو جائے گی۔ اس میں وقت بھی لگے گا اور مصارف بھی خاصے آئیں گے۔ مگر بالآخر مجھے اس بات کی قوی امید ہے کہ رسنا کے جسم کا الیکٹریکل توازن میں ضرور ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

مگن لال نے پرجوش طریقے سے ڈاکٹر ولیم رشر سے ہاتھ ملایا۔ کانپتی ہوئی لہرا امید آواز میں بولا۔

''ڈاکٹر! تم علاج شروع کر سکتے ہو۔''

ولیم رشر کو کئی بار سینما لے گیا۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ رسنا رومانٹک تصویریں بالکل پسند نہیں کرتی تھی۔ اور زیادہ تر HORROR پکچرز دیکھنا پسند کرتی تھی۔ ایسی تصویریں جن میں مجنونانہ مار دھاڑ ہو۔ یا پراسرار پر ہیبت ماحول ہو۔ یا خوفناک جسمانی اذیت کے پر ہول نظارے ہوں۔ ایسی تصویروں سے اسے ایک عجیب قسم کا ذہنی سکون ملتا تھا۔

ولیم رشر اسے کئی بار سمندر کے کنارے ٹہلانے لے گیا۔ اور پھر اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا۔ رسنا کو خاموش ستا ہوا سمندر پسند نہیں تھا۔ بپھرے ہوئے سمندر کی طوفانی لہریں اسے بے حد پسند آئی تھیں۔

''جی چاہتا ہے میں دوڑ کر ان میں کود جاؤں۔'' رسنا ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

''وہ اس وقت سمندر کے کنارے ایک سنسان ساحل پر کھڑے تھے۔ دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

''تو کود جاؤ!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''مجھے تیرنا نہیں آتا۔

''کوئی مضائقہ نہیں۔ کمر تک پانی میں نہاؤ۔ دور تک آگے مت جاؤ۔''

''میں ڈوب جاؤں گی۔'' رسنا کانپ کر بولی۔

''میں تمہیں بچالوں گا۔ مجھے تیرنا آتا ہے'' ___ ولیم رشر بولا۔ ''سارے کپڑے اتار دو اور پانی میں گھس جاؤ۔

''ہائے!'' رسنا ایک دم خوشی اور ڈر سے بول پڑی۔ ''میرے ہاں تو بکنی بھی نہیں ہے۔''

''کوئی پرواہ نہ کرو! میں منہ پھیر لیتا ہوں۔ تم کپڑے اتار کے مجھے سمندر میں گھس کر آواز دینا۔''

''نہیں!'' رسنا شرماتے ہوئے بولی۔ اس کے گال سرخ ہو گئے تھے۔ اور تیز ہوا سے اس کے بال

بکھر بکھر کے اس کے ماتھے پر آ رہے تھے۔

ولیم رشر نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی نرمی مگر بڑی مضبوطی سے کہا۔

''جیسا میں کہوں ویسا کرو!''

''تو تم اپنا منہ ادھر کر لو۔''

''لو کر لیا۔''

دھیرے دھیرے جھجکتے ہوئے رسنا نے سارے کپڑے اتار دیئے۔ صرف ایک چڈی اور چولی پہنے ہوئے پانی میں گھس گئی۔ اور لہروں سے کھیلنے لگی۔ یکا یک ہنسی کا فوارہ سارس کے منہ سے اُبل پڑا۔ وہ چیخ کر بچوں کی سی چنچل آواز میں بولی۔

''تم بھی آ جاؤ پانی بہت مزے دار ہے۔''

پانی رسنا کے سارے جسم میں گدگدی کر رہا تھا۔ جھاگ کے سفید سفید بلبلے اس کے سارے جسم کو چوم رہے تھے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی کی بانہیں۔ وہ اور بھی سمندر کے اندر پانی میں گھس گئی۔

''آ جاؤ! سمندر بہت مزیدار ہے۔''

''''آگے مت جاؤ! رشر نے اسے تنبیہ کی۔

''میں تو جاؤں گی۔'' رسنا بچوں کی طرح منہ کرتے ہوئے بولی۔

وہ دو قدم اور پانی کے اندر گئی۔

سمندر کی ایک بہت بڑی اچھالی یکا یک اس کے بدن سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ پانی بہتے ہوئے جذبوں کی طرح اس کے بدن پر سے گزر رہا تھا۔ جھاگ کی سیمیں کرنیں آوارہ قہقہوں کی طرح اس کے جسم پر رقصاں تھیں۔ رسنا خوشی سے بے اختیار ہنسنے لگی۔ لہریں اور دور تک انگڑائیوں کی طرح ٹوٹنے لگی تھیں۔

کھلا نیلا آسمان رشر کی آنکھوں کی طرح صاف اور بے داغ۔ دور دور، کہیں کہیں۔ اونچے لانبے ناہیل کے درخت رشر کے جوان اور مضبوط جسم کی طرح تنومند اور اکیلے..... سمندر کا پرشور آرکسڑا اور لہروں کی جوان بانہیں۔

رسنا نے دو قدم اور آگے کر لئے۔ اب پانی اس کے کندھوں تک تھا۔

''اب آگے مت جاؤ۔'' رشر مسکرا کر بولا۔ اور اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ رسنا اسے اپنے کپڑے اتارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

رشر نے قمیص اتار دی تھی۔ اس کے سینے کے بھورے بھورے بال ہوا میں ہولے ہولے ہلنے لگے

تھے۔جیسے اوپر پیڑ کی چوٹی پر ہوا میں ہلتی ہوئی ناریل کی سبز سبز مور پنکھیاں.....!

''اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' رشر رک کر بولا۔

رسنا زور سے ہنسی۔اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

یکا یک سمندر کی دوسری اچھال آئی، اور رسنا کے سر سے گزر گئی۔ جب گزر گئی تو رسنا کا کہیں وجود نہیں تھا۔صرف گرداب کے تھپیڑے تھے اور آلود سمندر، چند لمحوں کے بعد قریب کے پانیوں میں رسنا کا جسم رشر پانیوں میں ہاتھ مارتا نظر آیا۔وہ اچھل کر پانی میں کود گیا۔

''میں ڈوب رہی ہوں۔'' رسنا ایک بار زور سے چلائی۔پھر ڈوب گی۔

پھر دوبارہ جب ابھری تو رشر کی بانہوں نے اسے اوپر اچھال لیا۔وہ پانی میں بہت دور گہری نہیں گئی تھی۔ چند لمحوں میں رشر نے معاملے کو سنبھال لیا تھا۔وہ اب اسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے ساحل کی طرف لا رہا تھا۔

رسنا پانی کی کلیاں کرتی تھی۔ڈر سے اس کے سینے سے لپٹی جا رہی تھی۔خوف سے کانپتی تھی۔ بچ جانے سے خوشی تھی۔رشر کی بانہیں بہت آرام دہ تھیں۔اس لئے اسے کچھ برا سی بھی لگا۔جب صاف خشک ریت پر آ کے رشر نے اسے الگ سے لٹا دیا۔

''اٹ واز.....اٹ واز.....بچ.....اینڈ گو___'' (It was Touch and go)

ہانپتے ہوئے وہ انگریزی میں بولی۔

''شیور (SURE) رشر نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''تم میرے اس قدر قریب تھیں جبھی تو میں نے تمہیں پانی میں جانے کی اجازت دی تھی۔

رسنا کی گول گول کہنیاں ریت میں گیلے گڈھے بنا رہی تھیں۔وہ اپنے بازو سکوڑ کر ان گڈھوں پر اپنی انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔

''اگر میں ڈوب جاتی تو تم کیا کرتے؟''

''میں سمندر کو آواز دیتا۔اور لہروں کی اچھال میں تمہارا جسم وینس کی طرح برآمد ہوتا۔

''ڈاکٹر رشر!'' رسنا بولی

''مجھے دل کہو''

''دل؟''

''ہوں!''

''جانتے ہو تم نے آج میری جان بچائی ہے؟''

مگر دل دیر تک نہیں بولا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے چوڑے سینے پر باندھے لئے تھے۔ اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شاید وہ سو رہا تھا۔

پھر رسنا نہیں بولی۔

صرف سمندر دیر تک گرجتا رہا۔ اور کبھی کبھی کوئی لہر کانوں میں کوئی سرگوشی کر جاتی تھی۔ کوئی پون گھنٹے کے بعد جب دھوپ کے تولیئے نے ان کے گیلے جسم خشک کر دیئے تو رسنا ایک دم چونک کر اٹھی۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاتھ سے جھنجھور کر بولی۔

''اُٹھو گھر نہیں چلو گے کیا؟

کپڑے پہن کر وہ دونوں واپس گاڑی کی طرف چلے۔

یکا یک گاڑی میں بیٹھ کر رسنا نے اپنے دائیں کان کی لوح کو ہاتھ لگا کے کہا...''میرے کان کا ایک آویزہ شاید پانی میں ڈوب گیا۔''

''قیمتی تھا؟''

''ہیروں کا تھا۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔ کوئی مچھلی اسے نگل لے گی۔ کوئی ماہی گیر جال ڈال کر اسے پکڑے گا۔ کسی دوکان سے کوئی غریب عورت اس مچھلی کو خریدے گی۔ اور جب اس کا پیٹ چاک کرے گی تو دمکتا ہوا ہیرے کا بندہ ایک معجزے کی طرح برآمد ہوگا۔''

رسنا زور سے ہنسی۔''دل! تم بھی کتنی دلچسپ بات کرتے ہو۔ ایسی باتیں تو میرے شوہر نے آج تک کبھی مجھ سے نہیں کیں۔

دل بڑی سنجیدگی سے بولا۔''شوہر ایسی باتیں نہیں کرتے۔''اس نے بٹن دبا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

جب گاڑی اسٹارٹ ہو کر چلنے لگی تو دور کی اوٹ میں چھپا ہوا مگن لال دیر تک گردن گھما کے سڑک کے نیم دائرے میں گھومتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر جب گاڑی موڑ سے غائب ہوگئی۔ تو اس نے پھر اپنی آنکھیں سمندر کے پانیوں پر جما دیں۔ جس میں اس کی بنسی کی ڈور پڑی تھی۔

دیر تک وہ بنسی کی ڈور کو ہلائے بغیر سمندر کے پانیوں کو دیکھتا رہا۔

بہت رات گے مگن لال اپنے عجائب گھر میں گھومتا رہا۔ آج اس نے شدید مصروفیت کا بہانہ کر لیا تھا۔ اور رات کے کھانے پر بھی نہیں آیا تھا۔ اپنا کھانا اس نے اپنے عجائب گھر میں منگوالیا تھا۔ کھانا کھا کے

اور فرنچ کونیاک کے دو چھوٹے چھوتے جام پی کر وہ شیشی کے مجسمے کو اس کے بکسے میں سے کھولنے لگا۔ یہ بکسا آج ہی لندن سے بذریعہ ہوائی جہاز آیا تھا۔ بکسے میں شینی کا مشہور مجسّمہ پیک تھا۔ اس مجسمے کا نام تھا۔ انگڑائی....ایک عورت انگڑائی توڑ رہی تھی۔ مگن لال بڑی بیقراری سے مجسمے کو بکسے میں سے نکالنے لگا۔

بہت رات گئے کھان کھانے کے بعد بھی رسنا اور ولیم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے کھانے کے کمرے میں پھر ڈاکٹر کے کمرے میں جو رسنا کے کمرے سے لگا ہوا تھا۔ دل کے ہاتھوں پہلی مرتبہ رسنا نے تھوڑی سی پورٹ چکھی۔ وہ پیتی نہیں تھی۔ مگر دل نے اصرار کیا کہ یہ بھی علاج میں شامل ہے۔ شوپان کی دھیمی دھیمی موسیقی ریکارڈ پر چل رہی تھی۔ رسنا کی آنکھوں میں کیف وسرور چھلکنے لگا۔ نیم غنودگی کے نشے میں بولی.....مجھے نیند آرہی ہے۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ! میں ابھی آتا ہوں۔''

رسنا نے چونک کر کہا۔ ''تم کیوں آتے ہو؟''

''تمہارے جسم پر مالش کروں گا۔''

رسنا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر رشر نے رسنا کے بیڈروم میں دو ایئر کنڈیشنر لگوائے تھے۔ اس وقت اس نے ان کا ٹمپریچر درست کیا تھا۔ بتیاں بہت دھیمی کر دی تھیں اور اب وہ انتہائی سنجیدگی سے اپنی قمیض کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے رسنا کی پیٹھ پر بادمی رنگ کے ایک مرہم سے مالش کر رہا تھا۔ اس کے سدھے ہوئے مشاق ہاتھ پاؤں کی پوروں سے کمر کے خم تک جاتے تھے۔ اور مالش کے دائرے بناتے ہوئے لوٹ آتے تھے۔ رشر نے رسنا کو بتایا کہ اس مالش کا اثر جلد کے اندرونی خلیوں تک پہنچ کر دھیرے دھیرے رسنا کے اعصابی نظام کو درست کر دے گا۔

ڈاکٹر رشر کمر سے کندھے تک پہنچا۔ اب وہ ڈبل بیڈ کے ایک کنارے کھڑا ہو کر رسنا پر جھک کر اس کے کندھوں اور گردن پر مالش کر رہا تھا۔ مگر رسنا کا اعصابی نظام ٹھنڈا ہونے کے بجائے اس کے جسم کے رگ وپے میں چنگاریاں بھر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ سلگنے لگی۔ پاؤں کی پور سے لے کر گردن کے خم تک وہ اپنے بدن میں بجلی کی ایک تیز رو کو دوڑتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دم سادھے ہوئے پڑی رہی.....ہے بھگوان.....یہ بہت مشکل ہے.....بہت مشکل ہے.....اس نے جلدی سے بالوں کی ایک لٹ اپنے منہ میں دبالی اس کے نتھنے پھولنے لگے تھے۔ اور سانس زور زور سے چلنے لگی تھی۔

رسنا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔کل وہ یہ مالش نہیں کرائے گی صاف انکار کر دے گی۔

ہولے سے ڈاکٹر رشر نے اس کے بالوں کی لٹ اس کے منہ سے نکال لی۔اب اس کے مرہم سے چکنے ہاتھ اس کے بالوں میں تھے....ناں۔ناں....میرے بالوں کو مت چھوؤ رسنا نے اپنے دل میں کہا۔ مگر کچھ بول نہ سکی۔اس کا دم رکنے لگا۔رشر کے ہاتھ بالوں میں آہستہ آہستہ گھوم رہے تھے۔آہستہ آہستہ گردن اور گدی میں چٹکیاں لیتے ہوئے بالوں نے اندر کی جلد کو سہلاتے ہوئے بالوں کی ایک ایک لٹ کو سنوارتے ہوئے رشر کو ایسا لگا جیسے وہ شعلوں میں کنگھی کر رہا ہے۔

یکا یک کروٹ بدل کر رسنا اٹھی۔اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں۔اور ہونٹ ذرا سے کھلے تھے۔اس نے غیض وغضب کی ایک تیز نگاہ رشر پر ڈالی اور اپنے دونوں بازوؤں سے اس کی گردن کو جکڑ کر دیوانہ دار اس کے منہ کو چومنے لگی۔

.....دل!.....میرے دل.....!! میرے۔میرے۔میرے دل عجائب گھر میں مگن دونوں ہاتھوں سے اس سیاہ بت کے پاؤں پکڑے ہوئے رو رہا تھا۔دھیرے دھیرے کونے میں ریکارڈ چل رہا تھا۔

آج سجن مورے الگ لگے ہیں

سپھل بھئو مم دھیا___!

دن گزرتے گئے۔مگن زیادہ سے زیادہ اپنے عجائب گھر میں محصور ہوتا گیا۔محل نما گھر کا زنانہ حصہ رسنا کے کھلے مسرت آمیز قہقہوں سے معمور ہوتا گیا۔اس کی چال میں زیادہ پلک آ گئی تھی اور آنکھوں میں شراروں کی چمک کی جگہ ایک اجلی نتھری دھوپ نے لے لی تھی۔ایسی دھوپ جو ساون کی گھٹا برس جانے کے بعد آتی ہے۔اب رسنا ہر وقت گنگناتی رہتی۔اس پر غشی کے دورے بھی نہیں پڑتے تھے۔کئی کئی دن وہ مندر بھی نہیں جاتی تھی۔

تین ماہ بعد ڈاکٹر رشر انگلینڈ چلا گیا۔اس کے جانے کے چھ ماہ بعد رسنا کے یہاں بچہ ہوا۔کروڑ پتی خاندان کا وارث پیدا ہو گیا تھا۔دادا کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔دان پُن کرنے کے لئے اس نے اپنی تھیلیوں کا منہ کھول دیا۔

پہلی بار جب مگن نے اپنے بچے کو دیکھا تو دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہ گیا....رسنا نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اس کے چہرہ ایک مکمل نقاب تھا۔ڈاکٹر اور دو نرسیں قریب کھڑی اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔دادا

بھی اسی کمرے میں ایک طرف کھڑے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

بچہ بہت خوبصورت تھا۔ گلابی گلابی پھولے پھولے گال۔ اوران کے اوپر نیلی نیلی آنکھیں اور شفاف وودھیا ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پالنے میں پڑا خوشی میں ہمک رہا تھا۔

مگن نے جھک کر اس بچے کو گہری سنجیدگی سے اپنی باہنوں میں اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا۔ اس کے ماتھے پر ایسے بوسہ دیا۔ جیسے وہ ایک صلیب کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے بچے کو پالنے میں واپس رکھ دیا اور چپ چاپ کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے سال ڈاکٹر رشر پھر علاج کے لئے آیا تو تھا دو ماہ کے لئے۔ مگر رسنا نے اصرار کے مزید تین ماہ کے لئے اس روک لیا۔ اس کے جانے کے سات ماہ بعد پھر ایک لڑکا ہوا۔ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور تندرست.....!

دوسرے بچے کی زچگی سے فارغ ہو کر رسنا بھی تبدیلی آب وہوا کے لئے سوئٹزرلینڈ چلی گئی، اپنے دونوں بچوں کو لے کر۔ اس کا ارادہ چند ماہ کے لئے یورپ میں سیاحت کرنے کا تھا۔ کروڑ پتی سیٹھ نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس قیام کے دوران میں ڈاکٹر رشر پورے وقت رسنا کے ساتھ رہے گا۔ اور ہر دم اس کی صحت کا خیال رکھے گا۔

جب رسنا یورپ چلی گئی تو اس کے چند روز بعد ایک رات مگن لال اپنے باپ کی خواب گاہ میں گیا اور اس کہا۔

اب جب کہ آپ کے خاندان کے دو وارث پیدا ہو گئے ہیں۔ بلکہ ممکن ہے تیسرا بھی ہو جائے۔ میں یہاں سے جانا چاہوں گا۔

جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ میں نے آج تک تمہاری کون سی خواہش پوری نہیں کی ہے۔

سیٹھ چونی لال نے اس سے کہا.....''میں تو چاہتا تھا یورپ کے سفر پر تم بھی رسنا کے ساتھ جاتے۔ مگر تم نے خود ہی انکار کر دیا۔ اب کہاں جانا چاہتے ہو''؟

''آپ سمجھتے نہیں ہیں'' مگن لال نے اپنے باپ سے کہا۔''میں نے اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''کسی دوسرے گھر میں رہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں.....مجھے.....!'' مگن رک رک کر کہنے لگا۔''میں دراصل اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ سے ایک پیسہ بھی لینا چاہتا۔ صرف چند چیزیں لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر

کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا۔''

''مگر کیوں؟''

''وجہ آپ جانتے ہیں!''

سیٹھ چونی لال دیر تک چپ رہا پھر کسی قدر سخت لہجے میں بولا۔

احمق مت بنو! تم اگر میری جگہ ہوتے تو یہی کرتے جانتے ہو ہمارا خاندان، ہندوستان کے پہلے تیس خاندانوں میں سے ہے۔ دولت اور طاقت کے اعتبار سے یہی تیس خاندان ہندوستان پر حکومت کرتے ہیں۔ وزیروں کے نام اور عہدے بے شک بدلتے ہیں۔ مگر دراصل حکومت ہماری ہے۔ تم کیا جانتے ہو!؟ میں اس طاقت کو لاولد چھوڑ دیتا۔؟ اور اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں جانے دیتا؟''

''وہ بچے میرے بچے نہیں ہیں....اور باپ، وہ بیوی بھی میری نہیں ہے۔''

اس طرح سے یہ دولت جو ہم نے گذشتہ سو سال اکٹھی کی ہے، دراصل ہماری نہیں۔ اخلاق کے ایسے کھوکھلے اصول اسٹیج پر اور مذہبی کتابوں میں بڑے اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر زندگی میں ان کا کیا کام ....؟ تمہارے آباواجداد گر ان اصولوں پر چلتے تو آج ہم دونوں فٹ پاتھ پر ہوتے۔ احمق مت بنو!''

مگن لال نے بڑے غصے سے شانے اچکائے۔

اس کے باپ نے مگن لال کو شانے سے پکڑ کر قریب کی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خود پلنگ پر بیٹھا تھا۔ کرسی اور پلنگ کے بیچ میں ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ جس پر اس کے دونوں خوبصورت پوتوں کی تصویریں کیبنٹ سائز کے فریم میں جڑی رکھی تھیں۔

سیٹھ چونی لال کا ہاتھ دیر تک ان دونوں بچوں کے فریم سے کھیلتا رہا۔ اس کی بے چین انگلیاں کبھی ایک فریم پر جاتیں اور کبھی دوسرے فریم پر۔ آخر اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور تصویروں کی طرف اشارہ کر کے تیز نشتر کے انداز میں بولا۔

اس نے وہ دنیا چھوڑ دی تھی۔ اور اب اکیلا شہر کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ آتے وقت اس نے اپنے ساتھ کچھ نہیں لیا تھا۔ صرف چاندی کے اس چھوٹے سے فریم کو جس میں، میں بند تھا اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس کی جیب میں صرف چند آنے تھے اور وہ اسی طرح گھر سے نکل آیا تھا۔ چوروں کی طرح۔ باپ کو بتائے بغیر۔ کوئی چٹھی چھوڑے بغیر۔ مگر اب اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں جائے گا۔

وہ کیسے اپنی زندگی بسر کرے گا؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا.....وہ کیا کام کر سکتا ہے۔؟ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ دراصل آج تک جس دن سے پیدا ہوا اس نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کا سارا جسم تک مکمل بے کار رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں دل و دماغ، رگ وریشے، نسیں، پٹھے سب بیکار رہے تھے۔ زندگی بھر چاندی کے چمچوں سے اسے دودھ پلایا گیا تھا بے بہا کی انگوری دانوں کی طرح اُسے ہمیشہ نرم روئی ریشم اور سنجابہ میں لپیٹ کر رکھا گیا۔ اسے اپنے جسم کو کبھی ٹھیک سے استعمال کرنے کا موقع نہیں ملا۔

کچھ بھی ہو۔ وہ کبھی واپس نہیں جائے گا۔

دیر تک سڑکوں پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بے مقصد آوارہ وہ گھومتا چاہتا تھا۔ وہ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ اسے ڈر تھا اگر کہیں وہ رک تو کہیں واپس نہ چلا جائے۔ اپنی زندگی میں آج تک کبھی اتنا نہیں چلا تھا۔ محض چند قدم چلا تھا..... پورچ سے گاڑی تک۔ دکان سے فٹ پاتھ تک۔ لفٹ سے برآمدے تک۔ بس پیدل چلنے کے یہی چند قدم اسے یاد تھے۔ اس کے سارے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ پھر بھی وہ چلتا گیا۔

رات کیا گیارہ بجے وہ تھک کر سدا نند روڈ کے ناکے پر ایک بارہ منزلہ اونچی مگر نامکمل بلڈنگ کے باہر روڑی اور بجری کے ڈھیر پر سو گیا۔ سامنے سے سمندر کی کھلی خوشگوار ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ وہ کمر سیدھی کر کے پاؤں پھیلائے یہیں سو گیا۔

کب تک سوتا رہا اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ یکا یک کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑ کر جگایا۔ ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ تیز دھوپ کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھالے کی طرح چبھ گئی۔ وہ پلکیں جھپکائے آنکھیں ملتے جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

ایک کسی ہوئی تنومند سیاہ عورت بجری کی ٹوکری اٹھا۔ اس کے سر پر کھڑی تھی مگر پہلے نہ صرف اس نے اس کی ننگی سیاہ پنڈلیاں دیکھی تھیں۔.....انہیں دیکھ کر وہ ایک دم چونک گیا۔

شینی کا بُت؟.....جلدی سے اس کی نگاہ اوپر اُٹھ گئی۔

''اے بابو اٹھ! کب تک سوتا رہے گا؟''

اس کے سفید دانت بجلی کی طرح چمکے۔

''کیا رات کو دارو جیادہ چڑھا گئے تھے؟''

اتنا کہہ کر اس نے ڈھیر سے ٹوکری میں بجری بھری، اور ٹوکری کو اٹھا کے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر بلڈنگ کی طرف چلی گئی۔ وہ دیر تک اس کی لچکتی کمر اور ڈولتی چھاتیوں کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ کیا شینی نے اس عورت کو دیکھ کر وہ کالا بت بنایا تھا؟''

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے دونوں بازو اس نے ٹانگوں پر باندھ لئے اور گھٹنوں پر اپنی ٹھوڑی کو ٹکا لیا، اور اس عورت کو دیکھنے لگا۔ جواب پھر بجری اٹھانے کے لئے اس کے قریب آ رہی تھی۔

وہ بولی.....''اب گھر جاؤ۔''

وہ بولا.....''گھر تو چھوڑ دیا۔''

تو دھندے پر جاؤ۔''

''میں کوئی دھندا بھی نہیں جانتا۔'' وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''تو اب تک کیسے جندہ تھے؟

''عجیب آدمی ہو!'' سیاہ عورت نے حیرت سے سر ہلایا۔ اس کی ایک جھکتی ہوئی رٹ اڑ کر رخسار سے نیچے گر کر ہل رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اسے کس کر جوڑے میں باندھ لیا۔ پسینے میں اس کا جسم چمک رہا تھا۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔'' مگن لال نے اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیری۔

''وہ ادھر سیمنٹ اور بجری مکس کرنے کی جگہ پر پانی کا نل ہے۔ جلدی سے جا کے پی لو۔ پی کے آیا۔ پھر وہیں بجری کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔

''تم جاتے کیوں نہیں۔''؟ اس سیاہ عورت نے پھر ٹوکری میں بجری بھرتے ہوئے کہا۔

''بھوک لگی ہے۔''

''بھوک لگی ہے تو کوئی کام کرو۔''! وہ ٹوکری اٹھا کر پھر چلی گئی۔

جب واپس آئی تو مگن لال نے کہا۔''مجھے کوئی کام دلوا دو!''

''کیا کام کر سکتے ہو؟''

''جو تم کر سکتی ہو۔''

''میں تو بجری کی ٹوکری اٹھاتی ہوں۔''

''میں بھی اٹھا لوں گا۔''

وہ اس کے زرد چہرے اور اس کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر ہنسی۔ کچھ کہا نہیں اس نے ٹوکری اٹھا کے چلی گئی۔ پھر واپس آئی تو، سفید بالوں اور سفید مونچھوں والے ایک بڈھے کو ساتھ لے کر آئی۔

مگن کو دیکھ کر اس سفید مونچھوں والے بڈھے کے چہرے پر ایک تبسم آیا..... بولا۔

''اُٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

مگن لال اٹھ کر بجری کے ڈھیر پر کھڑا ہو گیا۔

بڈھے نے اسے سر سے پاؤں دیکھا۔ پھر بولا۔ ''کام کرے گا؟''

''کرے گا۔''

''ادھر مرد لوک کو ڈیڑھ روپیہ روج ملتا ہے۔ عورت لوک کو ایک روپیہ ملتا ہے۔ تمہارا شریر بہت دبلا ہے۔ جنانی کے ما فک ہے۔'' وہ ہنسا ''تم کو صرف ایک روپیہ روج ملے گا۔ چلے گا۔''

''چلے گا۔''

''تو پھر اٹھاؤ ٹوکری اور بجری بھرو!''

دن بھر وہ بجری بھرتا رہا۔ پہلی بیس پچیس ٹوکروں میں تو اسے تکلیف نہ ہوئی۔ پھر ہولے ہولے تو اورشل ہونے لگے۔ ٹوکری بھاری، معلوم ہونے لگی۔ جس سے پسینہ پھوٹ کر بہنے لگا۔ سورج کی کرنیں اس کے جسم میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگیں۔ اسے بار بار پیاس لگنے لگی۔ ہاتھ پاؤں بھاری محسوس ہونے لگے۔ جیسے اس کی رگوں میں خون پگھلا ہوا سیسہ بہہ رہا ہو۔ پھر بھی وہ دانت پیس کر دن بھر ٹوکری اٹھاتا رہا۔ دن میں دس مرتبہ اسے خیال آیا کہ وہ ٹوکری پھینک کر چلا جائے۔ سڑک پر سے گزرتی ہوئی ٹیکسی کو آواز دے کر روک دے اور سیدھا اپنے عیش و فراغت کے گہوارے میں واپس چلا جائے۔ مگر وہ دانت پیس کر کام کرتا رہا۔ شام کو جب اسے چھٹی ملی تو وہ اس بجری کے ڈھیر پر خالی ٹوکری پھینک کر ہانپتا ہوا لیٹ گیا۔ شام کی سمندری ہوا ہولے ہولے اس کے جسم کا پسینہ خشک کرتی گئی اسے نیند سی آنے لگی۔ اسے اپنے جسم میں انتہائی نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوا۔ کب اس کی آنکھیں بند ہو گیں؟ کب سو گیا؟ ایکا ایکی رات کو کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔

وہ کالی عورت اس کے سر پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی....''اُٹھ کھانا کھالو کیا بھوکے ہی سو جاؤ گے؟''

اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سمندر تاریک ہو چلا تھا۔ بارہ منزلہ نامکمل بلڈنگ ایک خوفناک ایک دیو کی طرح منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ اس کے قدموں میں مزدوروں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آگ جلائے کھانا کھانے میں مصروف تھیں۔ آواز میں گالیاں ہنسی، عورتوں کی چہکاریں۔ ننگ دھڑنگ کالے بچے۔ آدھی چپاتی ہاتھ میں لئے جبڑے چلاتے ہوئے۔

ایک موٹی چپاتی پر اس کالی عورت نے تھوڑا سا ساگ رکھ دیا۔ پہلے تو مگن کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کا کیا کرے؟ وہ چھری کانٹوں سے کھانے کا عادی تھا۔ اور کوئی طریقہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ مگر اب اسے بھوک بھی زوروں سے لگ رہی تھی۔ اس نے چپاتی کو توڑ توڑ کر بڑی سنجیدگی سے ایک سانبیج نما

سینڈوچ بنایا اور اسے بڑی ادا سے کھانے لگا۔ سیاہ عورت مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کھا کر اس نے کہا ''ایک چپاتی اور دو!''

''نہیں!'' وہ بولی۔ ''آج کل راشن مہنگا ہے۔ پہلے ہم دو چپاتی کھاتے تھے۔ اب ہم سب لوگ ایک چپاتی کھاتے ہیں۔''

''مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے۔''

''تو نل سے جیادہ پانی پی کر سو جاؤ۔ دوسری چپاتی نہیں ملے گی۔''

نل سے پانی پی کر وہ پھر اپنی جگہ لیٹ گیا۔ پر اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ آسمان پر تارے کھلے ہوئے تھے۔ وہ دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدل کر اپنے قریب لیٹی ہوئی سیاہ عورت کو دیکھا۔ وہ بھی اپنی کھلی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' مگن نے اس سے پوچھا۔

''تلسی'' وہ بولی۔

''تمہارا گھر والا کدھر ہے۔؟''

''کیوں؟''

''دارو پیتا تھا۔''

''کوئی بال بچہ''؟

''ایک لڑکی تھی۔ نانی مر گئی۔''

دیر تک وہ چپ رہا.....دیر تک وہ چپ رہی.....ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے رہے اور مگن کے بدن کو گدگداتے رہے۔

تلسی نے اپنے دونوں بازو اپنی چھاتیوں پر باندھ لئے تھے اور بظاہر آسمان کو دیکھنے میں منہمک تھی۔ پھر وہ اچانک بولی۔

''تمہارا نام؟''

''مگن۔''

''گھر والی؟''

''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے؟''

''کوئی بال بچہ؟''

''کوئی نہیں۔''

پھر رات بھر تلسی نہیں بولی۔ مگن بھی تارے گنتے گنتے سو گیا۔ صبح جب اٹھا تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ اور سارا جسم دکھ رہا تھا۔ پر اس نے تلسی کو کچھ نہیں بتایا ٹوکری اٹھا کے دم بھر کام کرتا رہا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے کام کرتے کرتے اس کا دم نکل جائے گا۔ مگر پھر بھی دانت پیس کر وہ کام کرتا رہا۔ شام کو بالکل بے دم ہو کر زمین پر بے سدھ پڑ گیا۔ رات تلسی نے اسے جگایا۔ وہ ہاتھ میں تھالی لئے اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اور اس کی طرف ہمدردی بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں تو بخار ہے''

''یونہی سا ہے۔''

''کوئی دوا لو گئے؟''

''نہیں کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''اٹھو! کھانا کھا لو۔ آج تو دو چپاتیاں ملیں گی۔''

تلسی نے تھالی اس کے سامنے رکھ دی۔ اپنا کھانا اس میں سے اٹھا لیا۔

''نہیں۔ تم تھالی لے لو۔ میں اپنی چپاتیاں ہاتھ میں رکھ کر کھا لوں گا۔''

''نہیں۔ تم تھالی لے لو'' تلسی نے اصرار کیا۔

مگن نے تھالی میں کھانا کھا لیا۔ کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ کچھ تو بخار تھا، کچھ تھکن، بالکل بے سدھ ہو کر سو گیا۔ رات کو تلسی دو ایک بار اٹھی اس نے مگن کو بجری کے ڈھیر پر بالکل بچوں کی طرح سوتے دیکھا۔ گول گیند کی طرح۔ گھٹنوں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے۔ تلسی نے اپنا پرانا بوسیدہ مگر گرم لحاف اس پر ڈال دیا۔ بہت صبح سویرے جب مگن کو پیاس لگی تو اس نے تلسی کے لحاف کو اپنے جسم کے اوپر دیکھا۔ قریب میں تلسی بے خبر سو رہی تھی۔ تارے ماند پڑ رہے تھے۔ بارہ منزلہ بلڈنگ کے نامکمل۔ دروازوں، کھڑکیوں کی مستطیلوں میں سے روشنی چھن کے آ رہی تھی۔

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار کل سے بھی تیز تھا۔ اور ہتھیلیاں بجری اٹھا کر سوج گئی تھیں۔

آج اسے کام کرتے ہوئے بے حد تکلیف ہوتی رہی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا جسم لکڑی کے جوڑوں سے بنا ہے۔ یا مشین کے زنگ کھائے ہوئے پرزوں سے آج وہ بہت جلد ہانپ جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے مرمرے سے ناچنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی سارا آسمان لال ہو جاتا ہے۔ سر میں چکر آتا ہے۔ تلسی نے اسے کام کرنے سے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا۔ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح دن بھر ٹوکری ڈھوتا رہا۔

شام تک خود بخود اس کا بخار کم ہو گیا۔ بدن ہلکا ہلکا سا لگنے لگا۔ دوسرے دن بخار اور بھی کم ہو گیا۔ تیسرے دن آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ کوئی دوا کئے بغیر۔ مگر ہاتھوں کی بری حالت ہو چکی تھی۔ ٹوکری ڈھوتے ڈھوتے کھال تک ادھڑنے لگی تھی۔ تیسری رات یہ حالت ہو گئی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا تھا۔

''میرے قریب آؤ۔ میں تمہیں کھلا دوں۔''

''نہیں!'' مگن نے سر ہلا کے انکار کیا۔ مگر روٹی اٹھا کر جو لقمہ توڑنا چاہا۔ تو لقمہ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

''ادھر آؤ۔'' تلسی گرج کر بولی اور اس نے مگن کی تھالی کو اپنے قریب سرکا لیا۔ مگن اس کے قریب چلا گیا۔

وہ ایک لقمہ توڑ کر اس کے منہ میں دیتی۔ دوسرا لقمہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھتی۔ دونوں جبڑے چلاتے ہوئے سرور نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تلسی کی آنکھیں تارے جیسی چمک رہی تھیں، اور مگن کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے رگ و ریشے میں رچا ہوا برسوں کا رنگ دھیرے دھیرے ڈھل رہا ہے، اس کی روح کے گرد جمی ہوئی برف کا دائرہ ہولے ہولے پگھل رہا ہے۔

کھانا کھلا کے اور تھالی برتن صاف کر کے تلسی نے کہیں سے تیل کی ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور مگن کے ہاتھوں کو دھیرے دھیرے چپڑنے لگی۔ تیل چپڑ کر اس نے اپنی ایک بے حد پرانی اور بوسیدہ ساری نکالی اور اس کی دھجیاں پھاڑ پھاڑ کر اس نے مگن کی دونوں ہتھیلیوں کو باندھ دیا۔

دوسرے دن مگن انہیں دھجیوں سے بندھے ہاتھوں سے ٹوکری اٹھا اٹھا کے کام کرتا رہا۔ اگلے چار پانچ دنوں میں اس کے ہاتھوں کے زخم بھر گئے۔

سوجن غائب ہو گئی.... ہاتھوں میں سخت گھٹے پڑ گئے۔ اب وہ بغیر کسی تکلیف کے اپنے ہاتھوں سے بجری بھر سکتا تھا۔ اس کے جسم کی زردی ہولے ہولے دور ہوتی گئی۔ کھلی ہوتی گئی۔ کھلی دھوپ، کھلی ہوا اور رات کی کھلی فضا سے اس کے جسم میں ایک نئی طاقت دوڑنے لگی۔ اگلے پندرہ بیس دن میں وہ اتنا اچھا کام کرنے لگا کہ سفید مونچھوں والے بڈھے نے اسے ترقی دے کر اسے مردوں کے گریڈ میں رکھ دیا۔ اب اسے ڈیڑھ روپیہ روز ملنے لگا۔ وہ تلسی کو دن کے کھانے کے پانچ آنے اور رات کے کھانے کے چھ آنے دیتا تھا۔ دو آنے کی چائے پیتا تھا۔ کبھی چار آنے کی۔ باقی پیسے وہ تلسی کے پاس ہی رکھ دیتا تھا۔ اس کے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔ پتلون پھٹ کر نیکر بن گئی تھی۔ اور گھٹنوں سے ذرا نیچے چیتھڑوں کی طرح لٹک رہی تھی.....مگر وہ خوش تھا۔

چند دن بعد تلسی اس کے لئے بھورے رنگ کی ایک لنگی لے آئی۔ اس نے اپنی نیکر نما چیتھڑوں والی پتلون اتار کر اسے وہ لنگی پہننے کو کہا۔ پہلے تو مگن نے انکار کیا مگر تلسی کا چہرہ دیکھ کر وہ مان گیا۔ آج وہ خوب نہایا۔ پہلی بار تلسی نے اس کے کپڑے دھوئے۔ اس کے بالوں میں تیل کر اس کے سر کی اچھی مالش کی۔ اور اپنے کنگھے سے سر کے بال سنوار دیئے۔ آج وہ بار بار بے اختیار مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی۔ اور جب چلتی تھی تو فضا میں اس کا جسم ایک ابابیل کی طرح ڈولتا ہوا۔ اور تیرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اسی طرح کام کرتے کرتے ایک ماہ اور گزر گیا۔ مگن اپنے بدن میں نئی پھرتی، چستی اور طاقت محسوس کرنے لگا۔ اس کا بدن سنولا گیا تھا۔ بانہوں کی مچھلیاں اُبھر آئی تھیں۔ اور پاؤں کے تلوے بجری کے پتھروں کی طرح سخت ہو چلے تھے۔ بلڈنگ بھی مکمل ہو چلی تھی۔ چند دنوں میں کام ختم ہو جائے گا۔ پھر انہیں یہ بلڈنگ چھوڑ دینا پڑے گی۔

''پھر ہم کیا کریں گے۔''؟ مگن نے کسی قدر پریشان ہو کر تلسی سے پوچھا۔ تلسی بڑی لاپرواہی سے بولی___ ''اونہہ! کسی دوسری بلڈنگ پر جا کے ٹوکری ڈھولیں گے۔ بہت بلڈنگیں بن رہی ہیں۔''

اس کے لہجے میں ایسا گہرا اطمینان تھا کہ مگن کو یقین آ گیا۔ وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس کے کان شور وغل کی آواز سے چونک گئے۔ اور وہ آنکھیں کھول کر بیدار ہو گیا۔

ایک آدمی تلسی کو لاتوں ہاتھوں سے گھسیٹ کر پیٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تلسی زور زور سے چلا رہی تھی۔ اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں میں ہاتا پائی ہو رہی تھی۔ ایک دم مگن لال گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور دونوں کے قریب جا کر بولا۔ ''یہ میری گھر والی ہے۔ اس کو لے جا رہا ہوں۔''

''نہ تو میرا گھر والا ہے، نہ میں تیری گھر والی ہوں۔ میں تجھ کو چھوڑ چکی۔'' تلسی غصّے سے چیخ رہی تھی۔ جب سے تو نے میری تانی جان لی۔ میں تجھ کو چھوڑ چکی۔ آج ڈیڑھ دو سال کے بعد تجھ کو اپنی گھر والی آئی۔''؟

''جانے دے جانے دے!'' دوسرا آدمی جو تلسی کے گھر والے سے بھی لمبا تڑنگا تھا۔ تلسی کو سمجھاتے ہوئے بولا..... ''اس کو معاف کر دے گھر چل!''

نہیں میں اس کے سنگ کبھی نہیں جاؤں گی۔ کبھی اس کے سنگ نہیں رہوں گی۔ دارو پی پی کر اس نے مجھے بھوکا مار ڈالا۔ میری ساری کمائی بھی چھین لیتا تھا۔ دارو پی جاتا تھا۔''

''اب نہیں پیئے گا۔'' دوسرا آدمی بولا۔

''کیسے نہیں پیئے گا؟ ابھی اس ٹائم تم دونوں دارو پی کر آئے ہو۔'' ''چلتی ہے کہ مار کھائے گی۔'' کھا کھرے نے تلسی کو لات مار کے کہا۔ مگن لپک کر کھا کرے کے سامنے آ گیا۔ غضب ناک لہجے میں بولا۔

''اس کو چھوڑ دو!''

''کیوں چھوڑ دوں؟'' کیا تم اس کے یار ہو؟''

مگن نے اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ کھا کھرے کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ مگن کو بڑی حیرت ہوئی۔ اسے معلوم نہیں تھا اس کے گھونسے میں اتنی طاقت ہوگی۔

کھا کھرے گالی بکتا ہوا مگن سے لپٹ گیا۔ ایڑی مار کر اس نے مگن کو نیچے گرا لیا۔ دونوں زمین پر اوپر تلے ہونے لگے۔ بجری کے ڈھیر سے لڑھکتے ہوئے دور تک نیچے چلے گئے۔ مگن غصّے میں دونوں ہاتھ پاؤں چلا کر دار کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کھا کھرے ہانپنے لگا تو اس کا دوست کھا کھرے کی مدد کو پہنچا۔ دونوں مل کر مگن کا مقابلہ کرنے لگے۔ مگن بڑی جیداری سے لڑتا گیا۔ مگر وہ دو تھے اور مگن اکیلا تھا۔ مگن کا پلہ ہلکا پڑنے لگا۔ دونوں مل کر اسے پیٹنے لگے تو تلسی میدان میں آ گئی۔ کبھی وہ ایک کو گھونسہ مارتی۔ کبھی دوسرے سے گھونسا کھاتی کبھی دانت کٹکٹاتی۔ کبھی پتھر اٹھا کے مارتی۔ مگر دوسرا آدمی بہت تگڑا تھا۔ اس نے تلسی کو بہت جلد چت کر دیا۔ اور وہ بھی بے دم ہو کر کھا کھرے کے قریب گر پڑی۔ اب لڑائی مگن اور اس تگڑے آدمی کے بیچ ہو رہی تھی۔ مگن ایک دیوانے کی طرح لڑ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ لڑتے لڑتے مر جائے گا مگر ہار نہیں مانے گا۔ اپنے جسم کا آخری زور لگا کے اس تگڑے آدمی کو زمین پر گرا دیا۔ اور پھر قریب سے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کے اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

''اب اُٹھے تو اس پتھر سے تمہارا سر کچل دوں گا۔'' مگن ہانپتے ہانپتے مگر شدید غصّے کے عالم میں بولا۔

تگڑے آدمی نے مگن کے غضب ناک تیور دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے۔ لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے بولا..... ''سالا اس ٹائم دارو پیا ہے بہت۔ لڑ نہیں، لڑ نہیں سکتا۔ صبح کا ٹائم ہوتا تو تم کو دکھاتا تھا۔ اس ٹائم ہم کو مافی دو۔''

اتنے میں بہت سے مزدور، مرد عورتیں اور بچے بھی جمع ہو گئے تھے۔ کھا کھرے اپنے دوست کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ مگن نے پتھر اپنے ہاتھوں سے نیچے زمین پر پھینک دیا۔

اس رات سفید مونچھوں والے بڈھے نے تلسی اور مگن کو صلاح دی کہ وہ دونوں باہر نہ سوئیں، نہ

بجری پر۔ بلکہ بلڈنگ کے اندر گراؤنڈ فلور کے کسی کمرے میں جا کے سو جائیں۔ کیا معلوم یہ لوگ پھر بدمعاشی کریں۔ اور دوسرے غنڈوں کے لے کر آئیں۔

ایک کمرے کے اندھیرے فرش پر دونوں لیٹے تھے۔ چپ چاپ... سمندر کی فاتحانہ گرج مگن کو اپنے دل کی دھڑکن کی بازگشت معلوم ہوتی تھی۔

''مگنے!'' تلسی بڑے کمزور لہجے میں بولی۔

''ہاں۔''

''تو میرے لئے کیوں لڑا؟''

''ایسے ہی۔''

''بہت چوٹ کھائی ہے۔''؟

''نہیں تو۔''

''کہاں کہاں چوٹ لگی مجھے بتا دو!''

''کہہ جو رہا ہوں کہیں چوٹ نہیں لگی۔''

''میں پوچھتی ہوں مگنے۔ تم میرے لئے کیوں لڑے؟

مگن چپ رہا۔ دیر تک چپ رہا۔ یکا یک اس نے محسوس کیا کہ تلسی کا ہاتھ اس کے جسم کو دھیرے دھیرے ٹٹول رہا ہے۔ ہوا کی سرگوشی سے بھی زیادہ کمزور آواز میں بولی....!

''کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟..... کیا یہاں چوٹ لگی ہے؟'' تلسی کی نرم نرم انگلیاں مگن کے جسم کو چھونے لگیں۔''

''ارے یہ کیا ہو رہا ہے؟..... یہ کیا ہو رہا ہے؟ مگن اپنے آپ سے پوچھنے لگا۔ میرا جسم کیوں گرم ہو رہا ہے، زمین سے بخارات اُٹھ رہے ہیں۔ سمندر کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ دیواریں سانس لے رہی ہیں۔ کسی مسرت آمیز خوشی میں کانپ رہی ہیں۔ مگن کے اپنے ہاتھوں سے چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہونے لگیں۔ رگوں میں خون لودینے لگا۔ آنکھوں میں شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے بڑی تیزی سے تلسی کو اپنی دونوں بانہوں سے گھسیٹ کر اپنے سینے پر گرا لیا۔ اور جذبات سے گلوگیر آواز میں آتشیں لہجے میں بولا۔

''آ تجھے بتاؤں مجھے کہاں چوٹ لگی ہے۔''

اب وہ اس بلڈنگ سے بہت دور شہر کے دوسرے حصّے سے گزر رہے تھے۔ کام کی تلاش میں....

مگن نے تلسی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں خوش خوش نئے شادی شدہ جوڑے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آنکھوں میں مسکراتے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک بہت بڑی محل نما عمارت کو دیکھ کر تلسی ٹھٹھک کر رک گئی۔ حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''کسی راجہ کا محل معلوم ہوتا ہے۔''

مگن اپنے گھر کی عالیشان عمارت کو دیکھ کر زور سے ہنسا۔ بولا

''ہاں۔ مگر اس محل میں سب نامرد رہتے ہیں۔ اتنا کہہ کر وہ تلسی کو گھسیٹ کر آگے لے گیا۔ محل پیچھے رہ گیا۔ نظروں سے دور ہو گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔

درشنا کے آنے کے بعد دنیا اک دم بدل گئی تھی۔ اب جھاڑیوں پر پھول لدے تھے۔ اور پیڑوں پر پھل۔ ہواؤں میں گوری کے بدن کی مہک تھی اور ندی کنارے دُور تک بھری گگریا اٹھا کر چلنے والی ناری کے نقش پا، اور کانوں میں اس کے پازیب کی سُریلی صدا، اب آسمان نیلا تھا اور دُور اوپر اونچی چوٹیاں اپنے برف کے دانتوں سے کھلکھلا کر درشنا کی طرح ہنستی تھیں۔

(دوسری برف باری سے پہلے ___ کرشن چندر)

پُرانے خُدا

کرشن چندر

متھرا کے ایک طرف جمنا ہے اور تین طرف مندر، اس حدود اربعہ میں نائی حلوائی، پانڈے، پجاری اور ہوٹل والے بستے ہیں۔ جمنا اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ نئے نئے عالی شان مندر بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن متھرا کا حدود اربعہ وہی رہتا ہے، اس کی آبادی کی تشکیل اور تناسب میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو پاتی۔ سوائے ان دنوں کے جب اشٹمی کا میلہ معلوم ہوتا ہے کرشن جی کے بھگت اپنے بھگوان کا جنم منانے

کے لیے ہندوستان کے چاروں کونوں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ان دنوں کرشن جی کے بھگت متھرا پر یلغار بول دیتے ہیں،اور مدراس سے،کراچی سے،رنگون سے،پشاور سے،ہر سمت سے ریل گاڑیاں آتی ہیں اور متھرا کے اسٹیشن پر ہزاروں جاتری اُگل دیتی ہیں،جاتری سمندر کی لہروں کی طرح بڑھے چلے آتے ہیں اور مندروں گھاٹوں،ہوٹلوں اور دھرم شالاؤں میں سما جاتے ہیں۔متھرا میں کرشن بھگتوں کے استقبال کے لیے پندرہ بیس روز پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔مندروں میں صفائی شروع ہوتی ہے۔فرش دھلائے جاتے ہیں۔کلسوں پر دھات پالش چڑھایا جاتا ہے،زرکار پنگوڑے اور جھولے سجائے جاتے ہیں دیواروں پر قلعی اور رنگ ہوتا ہے۔دروازوں پر گُل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔دکانیں رادھا کرشن جی کی مورتیوں سے سجائی جاتی ہیں۔حلوائی پوری کچوری کے لیے بناسپتی گھی کے ٹین اکٹھے کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے کرائے دُگنے بلکہ سہ گنے ہو جاتے ہیں۔دھرم شالائیں چونکہ خیراتی ہوتی ہیں اس لیے اُن کے مینیجر ایک کمرے کے لیے صرف ایک روپیہ کرایہ وصول کرتے ہیں۔کسان لوگ جوان خیراتی دھرم شالاؤں میں ٹھہرنے کی توفیق نہیں رکھتے۔عموماً جمنا کے کسی گھاٹ پر ہی سو رہتے ہیں گھاٹ چونکہ پختہ اینٹوں کے بنے ہوتے ہیں،اس کے لیے گھاٹ منتظم سونے والے جاتریوں سے ایک آنہ فی کس وصول کر لیتے ہیں اور اصل گھاٹ پر سونے کے لیے ایک آنے کا تاوان بہت کم ہے۔کنار جمنا۔سر پر کدم کی پرچھائیاں،جمنا کی لہروں کی میٹھی میٹھی لوریاں،ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔تاروں بھرا آسمان اور مندروں کے چمکتے ہوئے کلس۔جب جی چاہا سو رہے،جب جی چاہا اُٹھ کر جمنا میں ڈبکیاں لگانے لگے۔ایک آنے میں دو مزے،اس پر بھی بہت سے کسان لوگ گھاٹ کے غریب منتظموں کو ایک آنہ کرایہ بھی ادا کرنا نہیں چاہتے اور گھاٹ پر سونے اور جمنا پر نہانے کے مزے مفت میں لُوٹنا چاہتے ہیں۔انسان کی فطری کمینگی.....!

جنم اشٹمی سے دو روز پہلے میں متھرا میں آ پہنچا،متھرا کے بازار گلیاں اور مندر جاتریوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور جاتریوں کے ریوڑوں کو مختلف مندروں میں داخل کر رہے تھے،ان جاتریوں کی شکلیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ متھرا میں ہندوستان بھر کی بوڑھی عورتیں جمع ہو گئی ہیں،بوڑھی عورتیں مالا پھیرتی ہوئیں اور لاٹھی ٹیک کر چلتے ہوئے مرد....کھانستی ہوئی،گھٹیا کی ماری ہوئی رعشہ براندام مخلوق جو یہاں اپنے گناہ بخشوانے کی اُمید میں آئی تھی۔جتنی بدصورتی یہاں میں نے ایک گھنٹے کے عرصے میں

دیکھ لی، اتنی شاید میں اپنی ساری عمر میں بھی نہ دیکھ سکتا۔ متھرا کا یہ احسان میں قیامت تک نہیں بھول سکتا۔

متھرا پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے اپنے رہنے کے لیے جگہ تلاش کی، ہوٹل والوں نے بالکونیاں تک کرایہ پر دے رکھی تھیں۔ اور ان کی کھڑکیاں، دروازوں اور بالکونیوں پر جابجا جاتریوں کی گیلی دھوتیاں ہولیں لہراتی دکھائی دیتی تھیں۔ دھرم شالائیں جاتریوں سے بھڑ کے چھتّوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ کوئی مندر بنگالیوں کے لیے وقف تھا تو کوئی مدراسیوں کے لیے، کسی دھرم شالہ میں صرف نمبودری برہمنوں کے لیے جگہ تھی تو کسی میں صرف کائستھ ٹھہر سکتے تھے۔ اس سرائے میں اگر والوں کو ترجیح دی جاتی تھی، تو دوسری سرائے میں صرف امرتسر کے ارڑے ٹھہر سکتے تھے۔ ایک دھرم شالہ میں ایک کمرہ خالی تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر پانڈے جی سے کہا۔ میں ہندو ہوں، یہ دیکھیئے ہات پر میرا نام کُھدا ہوا ہے۔ اگر آپ انگریزی نہیں پڑھ سکتے تو چلئے بازار میں کسی سے پڑھوا لیجئے۔ غریب جاتری ہوں اپنی دھرم شالہ میں جگہ دے دیجئے آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

پانڈے جی کی آنکھیں غلافی تھیں اور بھنگ سے سرخ، جیوا کا مقدس تاگا ننگے پیٹ پر لہرا رہا تھا۔ کمر میں رام نام کی دھوتی تھی۔ چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑے مجھے گھورتے رہے، پھر گھگیائی ہوئی آواز میں جس میں پان کے چُونے اور کتھے کے بُلبلے سے اُٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، بولے آپ کون ہو،

میں نے جھلا کر کہا، میں انسان ہوں، ہندو ہوں، کالا شاہ کاکو سے آیا ہوں۔

ناں، ناں! پانڈے جی نے اپنا بایاں ہاتھ گوتم بدھ کی طرح اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم پوچھت ہیں۔ آپ کون گوت ہو؟

گوت؟ میں نے رُک کر کہا۔ مجھے اپنی گوت تو یاد نہیں۔ بہرحال کوئی نہ کوئی گوت ضرور ہوگی۔ آپ مجھے فی الحال اپنی دھرم شالہ۔ اس خیراتی دھرم شالہ میں رہنے کے لیے جگہ دے دیں، میں گھر پر تار دے کر اپنی گوت منگوائے لیتا ہوں۔

ناں، ناں! پانڈے جی نے پان کی پیک زور سے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ہم ایسو مانس کیسو راکھیں؟ نہ گوت نہ جات!

میں متھرا کے بازاروں میں گھوم رہا تھا۔ فضا میں کچوریوں کی کڑوی بو جمنا کے مہین کیچڑ کی سڑاند اور

بناسپتی گھی کی گندی باس چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ متھرا کی خاک جاتریوں کے قدموں میں تھی، ان کے کپڑے میں تھی، اُن کے سر کے بالوں میں، ناک کے نتھنوں میں حلق میں، میرادم گھٹا جاتا تھااور جاتری شری کرشن مہاراج کی جے کے نعرے لگا رہے تھے۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے رہنے کے لیے ابھی تک کہیں جگہ نہ ملی تھی۔ ایک پنواڑی کی دکان پر میں نے ایک خوش پوش خوش رو نوجوان کو دیکھا کہ سرتاپا بّراق کھدّر میں ملبوس، پان کلّے میں دبائے کھڑا ہے، آنکھوں سے اور چہرے سے ذہانت کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ لیا۔

مسٹر؟ میں نے اُسے نہایت تلخ لہجے میں مخاطب ہوکر کہا۔ کیا آپ مجھے جیل خانے کے سوا یہاں کوئی اور ایسی جگہ بتا سکتے ہیں جہاں ایک ایسا انسان جو ہندو ہو، پنجابی ہو، کالا شاہ کاکو سے آیا ہو اور جسے اپنی گوت کا علم نہ ہو، میلے کے دنوں اپنا سر چھپا سکے؟

نوجوان نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا، چند لمحوں کے لیے مجھے گھورتا رہا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ آپ پنجابی ہیں نا! اسی لیے آپ یہ تکلیف محسوس کر رہے ہیں ...دراصل بات یہ ہے کہ ...معاف کیجئے گا...پنجابی بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ یہاں سے لڑکیاں اغوا کر لے جاتے ہیں،

اور ان لڑکیوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو اس طرح اغوا ہو جاتی ہیں، میں نے پوچھا۔

ایک دُبلا پتلا آدمی جس کا قد بانس کی طرح لمبا تھا اور منہ چھچھوندر کا سا کھدر پوش نوجوان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ بابو صاحب، آپ متھرا کی بات کیوں کرتے ہیں۔ متھرا تو پوتر نگری ہے۔ میں تو بمبئی تک گھوم آیا ہوں، وہاں بھی پنجابیوں کو شریف محلوں میں کوئی گھسنے نہیں دیتا۔

دو چار لوگ ہمارے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ میں نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ کیا آپ نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے؟

جی ہاں! خوش رو نوجوان نے پان چباتے ہوئے جواب دیا۔

تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پنجاب سب سے آخر میں انگریزوں کی عمل داری میں آیا۔ اور چھوٹی بچیوں کو جان سے مار ڈالنے کی رسم جو ہندوستان کے صوبوں میں رائج تھی۔ پنجاب میں سب سے آخر میں خلاف قانون قرار دی گئی۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے شریف لوگ اکثر اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔

اُس سے کیا ہوا؟''

ہوا یہ کہ پنجاب میں مردوں اور عورتوں کا تناسب ایک اور پانچ کا ہو گیا۔ پانچ مرد اور ایک عورت، اب بتائیے باقی چار مرد کہاں جائیں، مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہر عورت ایک دم چار پانچ خاوند کر سکے، جیسا کہ تبّت میں ہوتا ہے، کیا آپ اس بات کی اجازت دیتے ہیں۔

نوجوان ہنسنے لگا۔

میں نے کہا پنجاب میں لڑکیاں کم ہیں۔ پنجابیوں نے دوسرے صوبوں پر ہات صاف کرنا شروع کیا، بنگال میں لڑکیاں زیادہ ہیں۔ وہاں لوگ ایک بیوی رکھتے ہیں اور ایک داشتہ جو عموماً ودھوا ہوتی ہے، سندھی اور گجراتی مرد سمندر پار تجارت کے لیے جاتے ہیں اور اکثر گھروں سے کئی سال غائب رہتے ہیں۔ اسی لیے سندھ میں ادم منڈلیاں بنتی ہیں اور گجرات میں بکری کے دودھ اور برہمچر یہ کا پرچار ہوتا ہے۔ مرض ایک ہے، نوعیت وہی ہے، اب آپ ہی بتائیے کہ شریف کون ہے اور بدمعاش کون؟ جو حقیقت ہے آپ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتے۔ اُلٹ پنجابیوں کو کوستے ہیں۔

نوجوان بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسا، پان گلے سنے موری میں جا گرا، وہ میرے بازو میں بازو ڈال کر کہنے لگا۔ آیئے صاحب میں آپ کو اپنے گھر لیے چلتا ہوں۔''

تھوڑے ہی عرصے میں ہم ایک دوسرے کے بے تکلّف دوست بن گئے وہ ایک نوجوان وکیل تھا ایک کامیاب وکیل، اس کا ذہین چہرہ، فراخ ماتھا، اور مضبوط ٹھوڑی اس کے عزم راسخ کی دلیل تھے۔ وہ مدراسی برہمن تھا۔ متھرا میں سب سے پہلے اُس کا دادا آیا تھا کہتے ہیں کہ اس کے دادا کے کسی رشتہ دار نے جو مدراس میں ایک مندر کا پجاری تھا، کسی آدمی کو قتل کر دیا، ٹھاکر جی کو ایک پجاری کے گناہ کے بار سے بچانے کے لیے میرے دوست کے دادا نے ایک رات کو مندر سے ٹھاکر جی کی مورتی کو اُٹھا لیا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر مدراس چل دیا۔ سفر کرتے کرتے وہ متھرا آن پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آتما کو سکون نصیب ہوا۔ اور اُس نے ٹھاکر جی کو ایک مندر میں ستھاپت کر دیا۔ آج اسی دادا کا پوتا میرے سامنے مندر کی دہلیز پر کھڑا تھا اور میں اس کے گٹھے ہوئے جسم اور چہرے کے تیکھے نقوش میں اس بوڑھے برہمن کے عزم اور اعتقاد کی جھلک دیکھ رہا تھا جس کی تصویر اس کی بیٹھک میں آویزاں تھی۔

نہا دھو کر اور کھانے سے فارغ ہو کر ہم میلے کی سیر کو نکلے، جوگلی بازار سے وشرام گھاٹ کی طرف

جاتی ہے اس میں سینکڑوں نائی بیٹھے استروں سے جاتریوں کے سر مونڈ رہے تھے۔ گول گول چمکتے ہوئے منڈھے ہوئے سر اُن سپید چھتریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے جو برسات کے دنوں میں خود بخود زمین پر اُگ آتی ہیں، جی چاہتا تھا کہ ان سپید سپید چھتریوں پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرا جائے! اتنے میں ایک نائی نے میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار اُسترا گھمایا اور مسکرا کر بولا، بابو جی سر منڈالو، بڑا پن ہوگا، میں نے اپنے دوست سے پوچھا یہ جاتری لوگ سر کیوں منڈاتے ہیں، کہنے لگا۔ دان پُن کرنے کی خاطر۔ یہ لوگ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی روحوں کے لیے دان پُن کرنا چاہتے ہیں اور اُس کے لیے سر منڈانا بہت ضروری ہے اور یہاں ایسا کون شخص ہے جس کا اب تک کوئی عزیز یا رشتے دار نہ مرا ہو، میں نے جواب دیا میری چندیا پر پہلے ہی تھوڑے سے بال ہیں۔ میں انہیں حجام کی دست بُرد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بال جو چندیا پر ہے اُن بالوں سے کہیں بہتر ہے جو حجام کی مٹھی میں ہوں، ہم لوگ جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے وشرام گھاٹ پہنچ گئے۔ گھاٹ پر بہت سی کشتیاں کھڑی تھیں اور لوگ ان پر بیٹھ کر جمنا جی کی سیر کے لیے جا رہے تھے ہم نے بھی ایک کشتی لی اور تین گھنٹے تک جمنا میں گھومتے رہے۔ جن کے کنارے پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مندروں اور دھرم شالاؤں کی چوبرجیاں اور کدم کے درخت نظر آجاتے۔ ایک جگہ دریا کے کے کنارے ایک پُرانے شکستہ محل کے بلند کنگرے نظر آئے۔ استفسار پر میرے دوست نے بتایا کہ اسے کنس محل کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ تین چار سو سال سے زیادہ پُرانا معلوم نہیں ہوتا، کہنے لگا ہاں اسے کسی مرہٹہ سردار نے بنوایا تھا۔ اب زود الاعتقاد لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اُسی کنس کا محل ہے جس کے ظلموں کا خاتمہ کرنے کے لیے بھگوان نے جنم لیا تھا میں نے پوچھا، کس زمانے میں ظلم نہیں ہوتے؟ وہ ہنس کر بولا، اگر یہی پوچھنا تھا تو متھرا کیوں آئے.....وہ دیکھو ریل کا پُل؟.... متھرا میں سب سے زیادہ خوبصورت شے یہی ریل کا پُل ہے، مضبوط جیّد بلند، ریل گاڑی نہایت پُرسکوں انداز میں جمنا کے سینے کے اُوپر دندناتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہتے ہیں کہ کرشن جی کے جنم دن کو جمنا فرطِ محبت سے اُمڈی چلی آتی تھی اور جب تک اس نے کرشن جی کے قدم نہ چھو لیے اس کی لہروں کا طوفان ختم نہ ہوا۔ جمنا میں اب بھی طوفان آتے ہیں لیکن اس کی لہروں کی ہیجانی اس ریل گاڑی کے قدموں کو بھی نہیں چُھو سکتی جو اس کی چھاتی پر دندناتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ جمنا کی سربلندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔

جب ہم واپس آئے تو سورج غروب ہورہا تھا اور وشرام گھاٹ پر آرتی اتاری جارہی تھی۔عورتیں رادھے شیام،رادھے شیام گاتی ہوئی جمنا میں نہارہی تھیں شنکھ اور گھڑیال زور زور سے بج رہے تھے، جاتری چڑھاوا چڑھارہے تھے، اور جمنا میں پھل اور پھول پھینک رہے تھے۔ پانڈے دکشنا سنبھالتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ آرتی اتارتے جاتے تھے۔ایک پانڈے نے ایک غریب کسان کو گردن سے پکڑ کر گھاٹ سے باہر نکال دیا۔کیونکہ کسان کے پاس دکشنا کے پیسے نہ تھے۔شاید کسان سمجھتا تھا کہ بھگوان کی آرتی پیسوں کے بغیر بھی ہوسکتی ہے۔

وشرام گھاٹ کی نچلی سیڑھیوں تک جمنا بہتی تھی،لیکن یہاں پانی کم تھا اور کیچڑ زیادہ تھا اور کیچڑ میں سینکڑوں چھوٹے موٹے کچھوے کلبلا رہے تھے اور مٹھائیاں اور پھل کھا رہے تھے۔ان کے ملائم مٹیالے جسم ان جاتریوں کی ننگی کھوپریوں کی طرح نظر آتے تھے جن کے بال نائیوں نے مونڈ کر صاف کر دیئے تھے۔رادھے کرشن رادھے کرشن، جاتری چلاّ رہے تھے۔نو بیاہتا جوڑے کشتیوں میں بیٹھے ہوئے مٹی کے دیئے روشن کر کے انہیں جمنا کے سینے پر بہا رہے تھے۔جن کے سینے پر اس قسم کے سینکروں دیئے روشن ہواُٹھے تھے اور نو بیاہتا جوڑے مسرت بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف تک رہے تھے، ہمارے بالکل قریب ہی ایک زردرُو نوجوان لڑکی نے مٹی کے دو دیئے روشن کیئے اور انہیں جمنا کے حوالے کر دیا۔ دیر تک وہ وہاں کھڑی اپنے ہاتھ اپنے سے لگائے اُن دیئوں کی طرف دیکھتی رہی اور ہم اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کی طرف دیکھتے رہے۔اس لڑکی کے ساتھ اس کا خاوند نہ تھا، وہ بیاہتا معلوم ہوتی تھی، پھر ان جھلملاتے ہوئے دیئوں کی لَو کو کیوں اس نے اپنے سینے سے چمٹالیا تھا،

یہ لرزتی ہوئی شمع محبت.....لڑکی نے یکا یک میرے دوست کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آہستہ آہستہ گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چلی گئی۔میرے دوست کے لب بھنچے ہوئے تھے، رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، کیا جمنا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ محبت کے دو کانپتے ہوئے شعلوں کو ہم آغوش ہوجانے دے۔یہ دیواریں، یہ پانی کی دیواریں، پیسے کی دیواریں، سماج، ذات پات اور گوت کی دیواریں.....!میرا دل غیر معمولی طور پر اُداس ہوگیا۔اور میں نے سوچا کہ میں کل متھرا سے ضرور کہیں باہر چلا جاؤں گا۔برندابن میں یا شاید گوکل میں، جہاں کی سادہ اور پاک وصاف فضا میں میرے دل کو اطمینان نصیب ہوگا۔

برندابن میں بن کم اور پکّی گلیاں اور کھلی سڑکیں زیادہ تھیں، برندابن کے عالی شان مندروں کی وسعت اور عظمت پر محلوں کا دھوکہ ہوتا تھا۔ راجہ مان سنگھ کا مندر، میرا کا مندر باہر عمارت میں کرشن جی کی مورتی موجود تھی، ہر جگہ پانڈے موجود تھے، انگریزی بولنے والے پڑھے لکھے گائیڈ، پہلے لوگ مندروں میں بے کھٹکے چلے جایا کرتے تھے، اب بھگوان نے گائیڈ رکھ لیے تھے، خدا وہی پُرانے تھے۔ لیکن جدید مذہب کے سارے لوازمات سے بہرہ ور، آخر یہ نئی تہذیب بھی تو اُنہیں کی بنائی ہوئی تھی۔

برندابن کے ایک مندر میں میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس میں سات آٹھ سو سادھو ہات میں کھڑتالیں لیے ایک ساتھ گا رہے تھے، رادھے شیام، رادھے شیام .... لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ.... باقاعدگی تنظیم، اندھا پن تہذیب اور طاقت کے ہزاروں راز اس رقت انگیز نظارے میں مستور تھے، ہر روز سینکڑوں بلکہ ہزاروں جاتری اس مندر میں آتے تھے اور بے شمار چڑھاوا چڑھتا تھا، سُنا ہے کہ ان اندھے سادھوؤں کو صبح شام دونوں وقت کھانا مل جاتا تھا اور ایک پیسہ دکشنا کا، باقی جو منافع ہوتا، وہ ایک لحیم شحیم پانڈے کی تجوری میں چلا جاتا، ایک اور مندر میں بھی میں نے ایسا ہی نظارہ دیکھا، فرق یہ تھا کہ یہاں اندھے سادھوؤں کی بجائے بے کس اور نادار عورتیں کرشن بھگوان کی استتی کر رہی تھیں۔ دن بھر اُستتی کرنے کے بعد اُنہیں بھی وہی راشن ملتا تھا جو اندھے سادھوؤں کے حصے میں آتا تھا۔ یعنی دو وقت کا کھانا اور ایک پیسہ دکشنا کا۔ ان اندھے سادھوؤں اور عوتوں کے سر منڈھے ہوئے تھے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے وشرام گھاٹ کے جاتری اور جمنا کے کیچڑ میں کلبلاتے ہوئے کچھوے یاد آ گئے۔ مذہب نے مندروں میں فیکٹریاں کھول رکھی تھیں اور بھگوان کو لوہے سے بھی زیادہ مضبوط سلاخوں کے اندر بند کر دیا تھا، ہر مندر میں ہر ایک جاتری کو ضرور کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا بعض دفعہ تو ایک ہی مندر میں مختلف جگہوں پر دکشنا ریٹ مختلف تھا۔ سیڑھیوں کو چھُونے کے لیے ایک آنہ، مندر کی چوکھٹ تک آنے کے لیے چار آنے۔ مندر کا کواڑ اکثر بند رہتا تھا اور ایک روپیہ دے کر جاتری مندر کے کواڑ کھول کر بھگوان کے درشن کر سکتا کئی ایک مندر ایسے تھے جو سال میں صرف ایک بار کھلتے تھے اور کوئی بڑا سیٹھ ہی اُن کی ''بوہنی'' کر سکتا تھا اور بہت سا روپیہ ادا کر کے مندر کے کواڑ کھول سکتا تھا۔ طوائفیت ہمارے سماج کا کتنا ضروری جزو ہے۔ اس بات کا احساس مجھے ایسے مندروں ہی کو دیکھ کر ہوا۔''

گوکل میں جمنا کے کنارے تین عورتیں ریت پر بیٹھی رو رہی تھیں، مارواڑ سے کرشن بھگوان کے

درشن کرنے کو آئی تھیں، زیوروں میں لدی پھندی ایک سادھو مہاتما نے انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسا لیا اور گیان دھیان کی باتیں کرتے کرتے انہیں مختلف مندروں میں لیے پھرے، اور جب یہ مارواڑی عورتیں گوکل میں ماکھن چور کنھیا کا گھر دیکھنے آئیں تو یہ مہاتما بھی اُن کے ہمراہ ہو لیے، عورتیں جمنا میں اشنان کر رہی تھیں، اور سادھو کنارے پر اُن کے زیوروں اور کپڑوں کی رکھوالی کر رہا تھا۔ جب عورتیں نہا دھو کر گھاٹ سے باہر نکلیں تو مہاتما جی غائب تھے، عورتیں سر پیٹنے لگیں، کرشن جی اگر ماکھن چراتے تھے تو سادھو مہاتما نے اگر چند زیور چرا لیے تو کون سا بُرا کام کیا۔ لیکن مہاتما کی یہ تکلف اُن بے وقوف عورتوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور وہ جمنا کی گیلی ریت پر بیٹھی مہاتما جی کو گالیاں دے رہی تھیں۔ بہت سے لوگ اُن کے آس پاس کھڑے تھے اور وہ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

''جی بڑا ظلم ہوا ہے ان غریب عورتوں کے ساتھ....''

''بھلا یہ گھر سے زیور لے کر ہی کیوں آئیں؟''

''اپنی امارت دکھانا چاہتی تھیں۔ اب رونا کس بات کا.....''

''اجی صاحب شکر کیجئے ان کی جان بچ گئی۔ اب کل ہی متھرا میں۔ ایک پانڈے نے اپنے ججمان اور اس کی بیوی کو اپنے گھر لے جا کر قتل کر دیا۔ ججمان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا۔ بیوی کے پاس ساٹھ ستّر ہزار کا زیور تھا... کسی مدراسی جاگیردار کا لڑکا تھا جی، اکلوتا لڑکا تھا... اس کے باپ کو پولیس نے تار دیا ہے، خیال تو کیجئے کیسا اندھیر مچ رہا ہے اس پوتر نگری میں۔''

''متھرا میں لوک سے نیاری!''

بہت رات گئے میں اور میرا دوست جمنا کے اس پار کھیتوں میں گھومتے رہے۔ جنم اشٹمی رات تھی، پھونس کے جھونپڑیوں میں جن میں غریب مزدور اور کسان رہتے تھے، مٹی کے دیئے روشن تھے اور جمنا کے دوسرے کنارے گھاٹوں پر بجلی کے قمقمے اور برہمنوں کے قہقہوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ پھونس کے جھونپڑوں کے باہر مریل سی فاقہ زدہ گائیں بندھی تھیں اور نیم برہنہ لڑکے خاک میں کھیل رہے تھے۔ کنوئیں کی جگت پر ایک بوڑھی عورت آہستہ آہستہ ڈول کھینچ رہی تھی۔ دو بڑی بڑی گاگریں اس کے پاس پڑی تھیں۔ کنوئیں سے آگے آم کے درختوں کی قطار تھی جو بہت دُور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ آم کے درخت اور آنولے کے پیڑ اور کھرنی کے مدور چھتنارے، یہاں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

ہوا میں ایک ہلکی اداس سی خوشبو تھی اور ستاروں کی روشنی ایسی جس میں سپیدی کے بجائے سیاہی زیادہ گھلی ہوئی تھی جیسے یہ روشنی کھل کر ہنسنا چاہتی ہے، لیکن شام کی اداسی کو دیکھ کر رُک جاتی ہے۔

میرے دوست نے آہستہ سے کہا۔ میں اور وہ کئی بار اُن کھرنی کے مدور سایوں میں ایک دوسرے کے ہات کے ہات میں دیئے گھومتے رہے ہیں... کتنی ہی جنم اشٹمیاں اس طرح گزر گئیں.... اور آج....!

میں خاموش رہا۔

چند دن ہوئے میرا دوست کہہ رہا تھا۔ مجھے قتل کے ایک مقدمے میں پیش ہونا پڑا۔ قاتل کو مقتول کی بیوی سے محبت تھی.... اور جب اسے پھانسی کا حکم سنایا گیا تو قاتل کسان نے جن حسرت بھری نگاہوں سے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں کی وارفتگی اور گرسنگی ابھی تک میرے دل میں تیر کی طرح چُبھی جاتی ہے۔

وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ سالہا سال ایک دوسرے سے پیار کرتے رہے۔ پھر لڑکی کے ماں باپ نے اس کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی.... یہ جمنا پر لوگ محبت کے دیئے کس لیے جلاتے ہیں؟... بڑے ہو کر اپنے ہی بیٹوں اور بیٹیوں کے گلے پر کس طرح چُھری چلاتے ہیں... وہ کسان عورت اب پاگل خانے میں ہے....؟

میں نے کہا محبت بھی اکثر بے وفا ہوتی ہے۔ رادھا کو کرشن سے عشق تھا لیکن رادھا اور کرشن کے درمیان بادشاہت کی دیوار آ گئی، اس نے کہا شاید تمہیں رادھا اور کرشن کی محبت کا انجام معلوم نہیں۔''

''نہیں'' وہ چند لمحوں تک خاموش رہا پھر آہستہ سے کہنے لگا....

....کرشن جی نے برندابن کی گوپیوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک بار پھر برندابن میں آئیں گے اور ہر ایک گوپی کے گھر کا دروازہ تین بار کھٹکھٹائیں گے جس گھر میں روشنی ہو گی اور جو گوپی دروازہ کھٹکھٹانے پر ان کا خیر مقدم کرے گی۔ وہ اُسی عشق کو سچا جانیں گے ___ اس بات کو کئی برس گزر گئے۔

ایک اندھیاری طوفانی رات میں جب بجلی کڑک رہی تھی اور بارش موسلا دھار برس رہی تھی کسی نے برندابن کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا اجنبی ہر ایک مکان پر تین بار دستک دیتا، اور پھر آگے بڑھ جاتا.... لیکن سب مکانوں میں اندھیرا تھا۔ سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ کسی نے اُٹھ کر دروازہ نہ کھولا۔

اجنبی نا اُمید ہو کر واپس جانے والا تھا کہ اُس نے دیکھا کہ دور۔ ایک جھونپڑے میں مٹی کا دیا جھلملا رہا ہے۔ وہ اس جھونپڑی کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھا۔ لیکن اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوئی۔ کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ جھونپڑے کے اندر دیئے کی روشنی کے سامنے رادھا بیٹھی تھی۔ اپنے محبوب کے انتظار میں، رادھا کے سر کے بال سپید ہو چکے تھے، چہرے پر لاتعداد جُھریاں۔

کرشن جی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''رادھا میں آ گیا ہوں۔''

لیکن رادھا خاموش بیٹھی رہی۔ دیئے کی لَو کی طرف تکتی ہوئی۔

رادھا میں آ گیا ہوں، کرشن جی نے چلا کر کہا۔

لیکن رادھا نے کچھ نہ دیکھا۔ نہ سُنا۔ اپنے محبوب کی راہ تکتے تکتے اس کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں اور کان بہرے۔

.....زندگی سے پرے، موت سے پرے انصاف سے پرے.....

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میرا دوست اپنی باہوں میں سر چھپا کر سسکیاں لینے لگا جیسے کسی نے اس کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا ہو جیسے پاگل عورت محبت کرنے کے جرم میں لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دی گئی ہو۔ زرد رو لڑکی وشرام گھاٹ پر حسرت بھری نگاہوں سے مٹی کے دیئوں کی لَو کی طرف تک رہی تھی اس کی حیران پتلیاں میری آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں۔ اندھے سادھو سر منڈائے ہوئے قطار در قطار کھڑے تھے اور کھڑتالیں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ رادھے شیام۔ رادھے شیام۔ رادھے شیام ___ لیف رائٹ۔ لیف رائٹ۔ لیف رائٹ۔ پرانے خدا ابھی تک مندروں، بینکوں فیکٹریوں اور کھیتوں پر قبضہ کئے بیٹھے تھے، وہ اپنے بہی کھاتے کھالے۔ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اُن کی ننگی توندوں پر جینو لہرا رہے تھے اور وہ نہایت دلجمعی سے اُن لاکھوں آوازوں کو سن رہے تھے، جو فضا میں چاروں طرف شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں.....رادھے شیام.....رادھے شیام.....''